

## جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب:	نقوش فکر و عمل
رشتات قلم:	امین الدین شجاع الدین
مرتب:	محمد ارشد لکھنؤ
صفحات:	۳۲۰
بہ اہتمام:	مروہ ایجوکیشن فاؤنڈیشن لکھنؤ
کمپوزنگ:	آفتاب کمپیوٹر سینٹر، مکارم نگر، لکھنؤ
قیمت:	(موبائل) 9198809256
	۱۲۰ روپے

## ملنے کے پتے

- ۱۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ
- ۲۔ ندوی بکڈپو، ندوۃ العلماء، لکھنؤ
- ۳۔ شباب بکڈپو، ندوہ روڈ، لکھنؤ
- ۴۔ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ
- ۵۔ مکتبہ عکاظ، دیوبند، سہارنپور
- ۶۔ فیصل پبلیکیشنز، دیوبند، سہارنپور

# فکر و عمل

امین الدین شجاع الدین  
رمضانین کا انتخاب {

ب

ش ندوی

یشنل فاؤنڈیشن  
لے پہاڑ لکھنؤ

نر

ندوہ روڈ، لکھنؤ

## فہرست مضامین

۹	ڈاکٹر کرنل محسن جلیل شمش	حرفے چند
۱۰	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	مقدمہ
۱۲	جناب مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی	تقریظ
۱۵	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	پیش لفظ
۱۸	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	تعارفی کلمات
۲۲	محمد ارشد دلکش ندوی	عرض مرتب

## راہ عمل

۲۵	اقرأ باسم ربك الذي خلق --- علم کا رشتہ اللہ کے نام کے ساتھ ہو
۲۸	پاک اور پیارا محمدی انقلاب
۳۱	داعی اعظم ﷺ ایک بے قرار ہستی
۳۵	حضور ﷺ کے دربار کی چند جھلکیاں
۴۲	جب شفیع اعظمؑ کے دل پر چوٹ پڑتی ہے
۴۵	حیات طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فریاد
۴۸	پیغمبر صحراء کو سرزمین ہی پتھر ملی عطا کی گئی تھی
۵۳	کتاب و سنت کے محض نام کی تاثیر
۵۵	تناؤ سے پریشان دنیا کے نام..... اسوۃ یوسفی کا ایک پیغام
۵۸	ماہ رمضان کا استقبال
۶۰	رمضان کے بعد چھٹی نہیں

سب کرتا ہوں

میری تعلیم و تربیت کا انتظام کیا

م کے نام

کتاب پلٹنا اور قلم پکڑنا سکھایا

ریشن، لکھنؤ کے نام

میدان کا فراہم کیا

نے کا حوصلہ رکھتے ہیں

محمد ارشد دلکش ندوی

۱۲۸	بابری مسجد کا مسئلہ۔۔۔، مایوسی کی نہیں صبر و ثبات اور احتساب کی ضرورت	۶۲
۱۳۲	دعوت دین سے غفلت۔ چند تلخ حقائق	۶۵
۱۵۱	مدارس خیراتی ادارے نہیں، خیر کے سرچشمے ہیں	۶۸
۱۵۴	مدارس ”تحفظ“ کے ساتھ ”خود احتسابی“۔۔ کو بھی نظر انداز نہ کریں!	۷۱
۱۶۰	صرف نصاب تعلیم ہی کا نہیں نظام کا بھی جائزہ لیجئے!	۷۴
۱۶۲	مسلمانوں کو جدید تعلیم اپنانے کی ضرورت	۷۶
۱۶۶	اربابِ مدارس کی خدمت میں ایک عاجزانہ درخواست	۷۹
۱۶۸	طلباء میں بے مقصدیت کا ذمہ دار کون؟	۸۲
۱۷۱	مدارس عربیہ کے طلباء کے مسائل اور ان کا حل	۸۴
۱۷۷	”مدرسہ بورڈ“ کی مخالفت کافی نہیں۔۔ مدارس خود اپنا وفاق بنائیں	۸۷
۱۷۹	ادقاف پر توجہ سے ملت کی تقدیر سنو سکتی ہے	۸۹
۱۸۲	اتحاد زندگی ہے اور انتشار موت	
۱۸۵	مردانِ کار کا مسئلہ	۹۲
۱۸۷	مذہبی جنون کا جواب مذہبی جنون نہیں	۹۶
۱۹۰	افادیت اور نافعیت کا لائحہ عمل	۹۸
۱۹۳	امت کی بیداری اور ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری	۱۰۰
۱۹۶	مثبت رویہ	۱۰۳
۱۹۸	قول و فعل کا تضاد	۱۰۵
۲۰۱	تعاون سے زیادہ ٹکراؤ کا روگ	۱۰۸
۲۰۴	واقعیت پسندی کی اثر خیزی	۱۱۲
۲۰۷	فلکِ تحریر کی نہیں، پیغام کی تھی	۱۱۹
۲۰۸	آگ اور مٹی کی کشمکش	۱۲۶
۲۱۲	جونری سے محروم ہے وہ خیر سے محروم ہے	

خط و بخشش ہے

لو اپنانے کی ضرورت

کی ضروری ہے

کی بھی ضروری ہے

م یہی ہے

نہیں؟

عورت کو بیدار تو کیا ہے!

ت پہلے سے کہیں زیادہ ہے

م۔۔ نہی عن المنکر

۲۷۲	بے پرکی	۲۱۴
۲۷۴	تعصب کا روگ	۲۱۶
۲۷۸	ہمارا مزاج قوم پرستانہ نہیں، داعیانہ ہو!	۲۱۸
۲۸۰	علیحدگی پسندی کا رجحان پنپتا کیوں ہے؟	۲۲۱
۲۸۲	”دوہرا معیار“ فساد کی جڑ ہے	۲۲۴
۲۸۴	متمدن دنیا کے یہ قیدی!!	۲۲۶
۲۸۷	عید میلاد النبی کے تقاضے	۲۲۹
۲۹۱	طوفان جب کشتی کے اندر ہو	۲۳۱
۲۹۴	کہیں ہم پر جعل سازی کا مقدمہ نہ قائم ہو	۲۳۵
۲۹۷	دجل و فریب کا جواب ہے حکمت و فراست	۲۳۸
۳۰۰	ہم اپنا امیج منفی نہ بننے دیں!	۲۴۰
۳۰۲	کاما، نہ کہ فل اسٹاپ	
۳۰۴	کیسے کیسے لوگ!!	
۳۰۷	سبحان تیری قدرت!	۲۴۳
۳۰۹	جو چھبے دل میں وہی تنکے لئے	۲۴۶
۳۱۴	جستہ جستہ	۲۴۸
		۲۵۱
		۲۵۳
		۲۵۶
		۲۵۸
		۲۶۰
		۲۶۲
		۲۶۵
		۲۶۷
		۲۶۹

مدداری

چیلنج کو قبول کیجئے

س

س

!

مدد کی ضرورت

تھانے میں

## مقدمہ

از: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى اما بعد

مولوی امین الدین شجاع الدین بھیونڈی، مہاراشٹر کے باشندے ہیں لیکن اردو زبان اور اسلامیات سے ان کا ایسا ربط رہا ہے کہ وہ فکری مسائل کو اچھے انداز میں اور اردو کے اچھے اسلوب میں پیش کرنے کی مؤثر صلاحیت رکھتے ہیں، ان کو متعدد اسلامی اور علمی رسائل میں ادارہ تحریر کی ذمہ داری ملتی رہی ہے اور اس کو انہوں نے بخوبی انجام دیا ہے، وہ نگفٹہ اور مؤثر اسلوب میں مسائل کو پیش کرتے ہیں، اور مسائل کا تجربہ بھی اچھا کرتے ہیں، انہوں نے مختلف پرچوں کی ادارہ تحریر کی ذمہ داری کی انجام دہی میں متعدد امور پر اچھے انداز سے روشنی ڈالی ہے، اور اپنا علمی اور تجزیاتی انداز اختیار کرنے کا اچھا ثبوت دیا ہے، اس کے سبب ان کے وہ مضامین جو ادارتی ہونے کی وجہ سے عموماً مختصر ہیں، ایک تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، رسالہ میں مضمون کے شائع ہونے سے مضمون وقت کی سلوٹوں میں عموماً کھو جاتا ہے، لیکن اگر اس کو اسی نوع کے مقالات کے ساتھ بطور مجموعہ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو ان کی افادیت کی عمر طویل ہو جاتی ہے، شاید اسی مقصد سے ان کے ایک قدردان مولوی محمد ارشد دلکش ندوی نے ان کے ان مضامین کا ایک انتخاب کیا ہے، اور اس طرح وقت کی ضرورت کے لحاظ سے جمع کر کے ایک کتاب کی شکل دے دی ہے۔ جسے مردہ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن لکھنؤ شائع کر رہا ہے۔

## چند

بعبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

رائیوں کا مجموعہ ہے جو صاحب اسلوب صحافی صاحب نے بانگ درا اور تعمیر حیات کے کے تقاضوں کا لحاظ ہے اور ملت کے امراض کا یر کیا ہے ان کے ان مضامین میں بڑا سامان ی پر بہترین نذرانہ عقیدت بھی ہے اور سیاسی تیں ادبی اسلوب میں موجود ہیں، اور معاشرہ

مولوی محمد ارشد دلکش ندوی (سکریٹری مردہ ی فکر مندی اور دلجمعی سے جمع و انتخاب اور پھر قیتی اور مفید امانت کا اضافہ کیا ہے۔ اب یہ کام ین بکڈ پوکو حاصل ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ے مفید بنائے۔

ڈاکٹر کرنل محمد حسن جلیل ششی

ست، مردہ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن لکھنؤ

## تقریظ

از مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی  
(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدیر البعث الاسلامی، لکھنؤ)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، علیہ الف الف تحیۃ وسلام۔ وبعد:

اہل علم ودانش کی طرف سے جب بھی فکر و عمل کے نقوش ابھرتے ہیں تو قول و فعل کی ہم آہنگی اور ان دونوں پہلوؤں میں حقیقی توازن کی ایک خوبصورت روشنی کی لکیر نظر آتی ہے، اور دل مسلم میں فکر و عمل اور قول و فعل کی جامعیت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے، اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ ہمارے علماء اور انشاء پر داز اس حسین امتزاج کی دعوت دیتے ہیں اور اس کے نہ پائے جانے کی وجہ سے مسلم معاشرہ کو خاص طور سے شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور دین کی تعلیمات سے لاپرواہی اور غفلت کا ایسا ناپسندیدہ منظر نظر آتا ہے کہ گویا دین اسلام کے اندر وہ کشش باقی نہیں رہی، جو اس کا طرہ امتیاز تھا کہ اہل دین کی زندگی اور ان کی سیرت و کردار کو دیکھ کر ایسے لوگ جن کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جاتا تھا، وہ بھی ان سے متاثر ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔

آج ہمارے اسلامی معاشرہ میں جس چیز کا فقدان ہے وہ شاید اسی سلسلہ طلائی کا بکھراؤ ہو سکتا ہے، اور اگر ہم چاہیں تو اس کو کسی اور اچھے انداز سے تعبیر کر سکتے ہیں، آج امت مسلمہ کو جس چیز کا شکوہ ہے وہ یہی قول و عمل کا خلا ہے، جس کا فائدہ اسلام مخالف

دھکی جائے گی، اور اس میں جو مسائل زیر تحریر  
میں کیا گیا ہے اس سے واقفیت کا فائدہ حاصل

سے میں عرصہ دراز سے واقف ہوں جب وہ  
ہے تھے اسی وقت سے وہ رابطہ رکھتے تھے،  
ہے اسی ادارے سے تدریسی طور پر وابستہ بھی  
ہیں، اور اسلامی نقطہ نظر رکھنے والے صحافی  
میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان  
رہے ہیں، اس میں ندوۃ العلماء کا ترجمان

کچھ خاندانی بھی ہے، یہ بات اس لیے بھی کہی  
باغ الدین صاحب جو کہ مسجد حرام مکہ مکرمہ میں  
اس کے ساتھ وہ ایک اچھے اہل قلم بھی ہیں،  
بی بی سے اس کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں  
حالات پر تبصرہ پیش کرتے رہتے ہیں۔  
ئے، اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

مابوس کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے مضامین کا مجموعہ ”نقوش فکر و عمل“ کے نام سے **دارین بکڈپو** لکھنؤ شائع کر رہا ہے، ان مضامین کی جمع و ترتیب کا کام محمد ارشد دلکش ندوی نے انجام دیا ہے، اور دلکش انداز میں اسکو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ تعالیٰ مضمون نگار اور مرتب دونوں کو محض اپنے فضل و کرم سے بیش از بیش جزا عطا فرمائیں، اور دین و دنیا کی جامعیت کا نمونہ پیش کرنے کے نتیجہ میں اس کتاب کو قبول عام اور نفع عام کا ذریعہ بنائیں۔

۲۶ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ

۱۵ نومبر ۲۰۰۹ء

اس خلا کا استحصال کر رہی ہیں اور اس خلا کا ایسے وسائل و ذرائع استعمال کر رہی ہیں جو کسی ہ میں انہوں نے بہت سے تجربے کئے، لیکن ش اور پر فریب انداز میں مغرب کی سڑی گلی میں اور بے غیرتی کی تشہیر کر رہی ہیں، یہ مخالف لڑکوں کا لباس پہنانے میں کامیاب ہو چکی مٹی ہوئی ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے ہمارا مسلم ہے کہ مرد وزن میں کوئی فرق نہیں ہے، چنانچہ انی انجام دہی میں کوئی تا مل نہیں، سوسائٹی کی ہے تاکہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے بچوں کی تعلیم پارکوں، کلبوں اور تمام تفریحی جگہوں جب کہ حضورؐ نے عورتوں کو ”ناقصات العقل“ کی جگہ دو مونٹ گواہ کو مقرر کیا ہے، اس سے راحت میں نماز چھوڑنے کا حکم ہے، جس کی ہے ان کا نقص ظاہر ہوتا ہے، اس زبردست تعلیم مردوں کے برابر ہو کر اور نو جوان لڑکے اور ینت بخش سکتے ہیں؟

تھ ہمارے معاشرہ پر اثر انداز ہو رہا ہے، فکر مل تمام مسلم اہل علم و دانش کا فریضہ ہے کہ وہ سیلاب کو روکنے کے لئے ہر طرح کے بند تعمیر رین کے قلم میں بڑی طاقت ہے، انہوں نے کا جواب دینے اور مخالف اسلام طاقتوں کو

لاحق ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ معاصر میڈیا کے سطحی مگر ذہنوں کو تختل کر دینے والے سیلاب بلاخیز سے نبرد آزما ہونے کے لئے کم سے کم لفظوں میں اپنے مدعا کو بیان کرنے اور ”از دل خیز دبر دل ریز“ کے مصداق خود کو خدا لگتی بات کہنے کا اہل بنایا جائے۔ لکھنا برائے لکھنا اور صحافت کے نام پر زرد صحافت کو فروغ دینا اردو کے مقبول عام رسائل اور اخبارات کا وطرہ ساین گیا ہے۔ غیر ضروری تمہید، پس منظر پر زور اور سیاق و سباق کو نفس مضمون سے زیادہ اہمیت دینے کا رواج عام ہے۔ اس صورت حال میں زیر نظر مضامین میں براہ راست اپنے مدعا کو زبان دینے، ہر مسئلے کے مرکزی نکتہ کو نمایاں کرنے اور باتوں کو بغیر الجھائے بیان کرنے جیسے رویے بلاشبہ لائق صد تحسین ہیں۔

مصنف نے اپنی فیض رسانی کے لئے محض مذہبی حوالوں کا سہارا نہیں لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا علمی دائرہ کار خاصا وسیع ہے۔ وہ قرآن وحدیث کی بنیادی تعلیمات کو زیادہ دل نشین انداز میں بیان کرنے کی خاطر مشرقی اور مغربی ادبیات سے بھی استفادہ کرتے ہیں منطقی وثقافتی رویوں کو بھی زیر بحث لاتے ہیں، اپنے گرد و پیش سے بھی مثالیں پیش کرتے ہیں، اور مجموعی طور پر ایک ایسے مفکر و نکتہ رس دانش ور کا کردار ادا کرتے ہیں جس نے اپنے زمانے کے تقاضوں پر بھی غور و خوض کیا ہے، دین کو صرف دین ہی نہیں دنیا اور اہل دنیا کے نقطہ نظر سے بھی دیکھا ہے اور قاری کی نفسیاتی تربیت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر مذہبی تبلیغ و تلقین کرنے والوں میں وسیع القلمی اور وسیع المنہج نہ ہو تو اس کی پیغام رسانی اپنے اندر کشش کا عنصر نہیں شامل کر پاتی؟ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے انداز میں اس طرح کہا تھا۔

فقیہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری

فقط یہ بات، کہ میں چاہتا ہوں دل کی کشاد

امین الدین شجاع الدین ایک ایسے ادیب اور صحافی ہیں جن کے اندر وسیع القلمی بھی ہے، نفسیات شناسی بھی اور اپنے مدعا کو بغیر کسی اغلاق کے شفاف انداز میں بیان کر دینے کی اہلیت بھی، ان کی زبان شستہ، اسلوب بیان دل نشیں اور طریق اظہار دانش

لفظ

از: پروفیسر ابوالکلام قاسمی

(شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کی زیر طبع کتاب ”نقوش فکر و عمل“ کا مسودہ سعادت حاصل نہیں ہوتی تو ہمیشہ اس عالم اور سیت سے ناواقفیت کا افسوس رہتا۔ ناچیز نے کبھی تھیں مگر ان پر توجہ مرکوز کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ طرح اختصار اور جامعیت کے ساتھ بڑے سادگی مگر گہرائی کے ساتھ زیر بحث لانے کی نے اور اخلاقی حمیت کو بیدار کرنے کا وسیلہ بن شرف و امتیاز کا ہو یا اخلاقی تعلیم یا پیغام رسانی خود ہے جس سے بنی نوع انسان کو حکمت آمیز نے کا سبق سکھایا گیا۔

نکتہ کار صحافی، نکتہ رس مفکر اور با مقصد ترجمان فروز ہیں۔ ہمارے عہد میں جس طرح روز بہ کے مقابلے میں نظر انداز کئے جانے کا اندیشہ



تاری سے آشنا کرنے کا ہنر جانتے ہیں، اسی  
نے جاذب توجہ ہوتے ہیں کہ پورا مضمون پڑھ

## تعارفی کلمات

ین شجاع الدین کی کتاب، نقوش فکر و عمل، کا  
ب کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی اور اس کی

از: پروفیسر محسن عثمانی ندوی  
(انگلش اینڈ فورین لینگویجز یونیورسٹی، حیدرآباد)

’شہاب نامہ‘ کے مصنف قدرت اللہ شہاب نے اپنی اس خودنوشت میں ایک جگہ  
یہ ذکر کیا ہے کہ ہائی اسکول کی تعلیم کے زمانے میں انہوں نے اردو ادب کی مشہور و متداول  
کتا ہیں نہ صرف پڑھ لی تھیں بلکہ ایک حد تک ادبی نوعیت کا اعتراف کر کے ان کتابوں کی  
تعبیرات اور خوبصورت جملوں کو زبانی یاد کر لیا تھا، اور جب اسکول کی سالانہ تقریب میں  
مجھے تقریر کرنے کا موقع ملا تو اردو ادب کی کتابوں کے وہ جملے فراٹے بھرتے ہوئے زبان  
سے نکل رہے تھے۔

شعر و ادب کا ذوق کسی نہیں بلکہ وہی ہوتا ہے اگر قدرت کی طرف سے یہ ذوق  
ودیعت نہیں کیا گیا ہے تو انسان چاہے جتنی محنت کر لے اور پورے کتب خانوں کو اپنی  
یادداشت کے خزانے میں اتار لے تو بھی شاعر و ادیب بن سکتا، انسان اپنے مطالعہ اور  
اپنی محنت سے بہت بڑا عالم اور اسکا لرتو بن سکتا ہے، شاعر اور ادیب بننے کے لئے توفیق  
خداوندی کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر یہ نعمت خدا داد کسی انسان کو مل جاتی ہے تو پھر انسان  
اپنی محنت اور مطالعہ سے اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکتا ہے۔

امین الدین شجاع الدین ادب کا فطری ذوق رکھتے ہیں اور جب وہ اپنے وطن  
میں اسکول کے طالب علم تھے اسی وقت سے بچوں کے رسالے نور اور غنچہ پڑھا کرتے تھے



## عرض مرتب

ندوہ میں میری طالب علمی کا زمانہ تھا میں اپنے ساتھی طلبہ کے ہاتھوں میں ایک رسالہ بانگ درادیکھا کرتا تھا طلبہ اسے بہت شوق سے پڑھتے تھے اور چند ایک مضامین کا چرچا کرتے تھے معلوم ہوا کہ ندوہ کے قریب مولانا سلمان الحسنی کی جمعیت شباب الاسلام کا دفتر ہے، وہاں سے شباب الاسلام کا ترجمان بانگ دراشائع ہوتا ہے اس میں طلبہ تین کالم بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے ایک اپنی بات، دوسرا انٹرویو اور تیسرا آخری صفحہ۔ مجھے بھی اشتیاق ہوا کہ میں بھی اس رسالہ کو اور مضامین کو دیکھوں۔ جب میں نے مذکورہ بالا تینوں کالم دیکھے تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ مضمون کے جملے باہم مربوط ہیں اور قاری اگر اسے پڑھنا شروع کرے تو وہ مضمون کو ختم کر کے ہی دم لے گا۔ دوسری خصوصیت یہ کہ مضمون مختصر، ایک صفحہ کا مضمون لیکن اس ایک صفحہ میں مضمون نگار اپنی بات کہہ دیتا ہے اور ایک فکر سامنے آتا ہے۔ انٹرویو اگرچہ بڑے ہوتے تھے لیکن قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی۔ انٹرویو کسی اہم شخصیت کا ہوتا اور اکثر حالات حاضرہ کے مطابق۔ مثلاً جن دنوں لکھنؤ میں شیعہ سنی فسادات ہو رہے تھے تو اس میں بیک وقت دو انٹرویو شائع ہوئے ایک لکھنؤ کے سنی حلقہ کے رہنما مولانا عبدالعلیم فاروقی کا اور دوسرے شیعہ رہنما ڈاکٹر کلب صادق قبلہ کا۔ موضوع سے دلچسپی کی وجہ سے قارئین اسے نہ صرف پڑھتے بلکہ وہ موضوع، گفتگو کا موضوع بن جاتا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ان تینوں مقبول کالموں کا مضمون نگار ایک ہی شخص ہوتا اور اس پر نام شائع ہوتا امین الدین شجاع الدین، کا مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ بانگ دراکے دفتر جا کر ان سے ملاقات کروں۔ جس قدر ان کی تحریروں میں جان تھی اس کے برعکس وہ

جو آپ کے ہاتھ میں ہے ندوۃ العلماء کے ہ اور انتخاب ہے، یہ وہ مضامین ہیں جو امین میں بہت پسند کئے گئے۔

کا انتخاب مشک و گلاب سے زیادہ بہتر ہوتا ہے خیال کو معطر کرتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ گے اور ان کو بقائے دوام کی نعمت حاصل ہوگی۔

کام کو شروع کیا اور اب الحمد للہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں بہت زیادہ شکر گزار ہوں حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا جناب مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن صاحب اعظمی ندوی مدظلہ العالی مدیر البعث الاسلامی، مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء و چانسلر انگریز یونیورسٹی لکھنؤ کا، پروفیسر محسن عثمانی (انگلش اینڈ فارین لینگویجز یونیورسٹی حیدرآباد) کا اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا کہ ان شخصیتوں نے کتاب پر تقریظ پیش لفظ اور مقدمہ لکھنے کی (باوجود اپنی شدید مصروفیات کے) ہماری درخواست کو قبول فرمایا، کتاب کو زینت بخشی اور اسے اعتبار و اعتماد بخشا، بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم برادر مولانا منور سلطان ندوی صاحب کا شکریہ نہ ادا کریں کہ انکی تحریک پر ہی اس کام کا آغاز کیا اور انکے تعاون سے ہی یہ مجموعہ تکمیل کو پہنچا، آخر میں تمام معاونین کا شکریہ اور **دارین بک ڈپو** کے ذمہ داران کا شکریہ کہ انہوں نے اس کی اشاعت کر کے ہم سب کی محنت کو ٹھکانے لگایا۔ اللہ رب العزت ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہماری اس کوشش کو شرف قبولیت بخشے۔

والسلام

محمد ارشد دلکش ندوی

ان میں ان کی جو تصویر لے کر گیا تھا ان کی فو حال یہ تھا کہ بادی النظر میں گمان کرنا مشکل ہیں۔ ان کے مضامین میں فکر کے ساتھ ملت حالات حاضرہ کے پیش نظر رہنمائی ملتی تھی۔ ان گیا اور ان کے تین کالموں کو بڑے شوق

لگا پھر ایسا ہوا کہ امین الدین شجاع الدین اور خوش قسمتی سے ہمارے درجے میں ان کا مارے لئے دلچسپ ہو گیا جب وہ انگریزی تو لطف آ جاتا۔

و عالم مولانا عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیم تھے کو بلند کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ اکابر صاحب تعمیر حیات کے رئیس التحریر ہو گئے اب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی یا مولانا عبداللہ فیض امین الدین شجاع الدین صاحب کا ہوتا اور تے اس طرح یہ کالم مقبول ہوتے گئے۔

امین شجاع الدین صاحب لکھتے اور سہل انداز تنقید ہو سکتا سہل انداز کے ساتھ ان کا ادبیانہ تے اس طرح افادیت کی وجہ سے ان مضامین مضامین کی ضرورت پیش آئی تو رسالوں کے س جاگا کہ فائلوں میں منتشر اور بکھرے ہوئے نے چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس

دل سا دوست نہ دل سا دشمن

کامل رہبر، قاتل رہزن

یہی بات علم اور تعلیم پر بھی صادق آتی ہے کہ اگر علم کا رشتہ اپنے رب کے نام سے خدا  
نخواستہ منقطع ہو گیا یا خدا نخواستہ یہ سفر رب کے ہی نام سے شروع نہ ہوا تو پھر یہی علم تعمیر گلستان  
کے بجائے چمن کو افسردہ کرتا اور اجاڑتا ہے اور انسانی قافلوں کا رہبر نہیں رہزن بن جاتا ہے۔  
علم و تعلیم کا یہ پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب معاملہ علم کی وسعتوں اور  
پہنائیوں کا ہوان دنوں دنیا تباہ کن آلات، خودکش بم دھماکوں، میزائیلوں اور زہریلی گیسوں  
کی صورت میں نام نہاد علم کی اصلیت کو دیکھ رہی ہے۔

لیکن علم و تعلیم کا ایک پہلو اور ہے جو بڑا سطحی ہے اور جس میں نہایت اٹھلا پن ہے  
اور وہ ہماری یونیورسٹیوں کا عمومی ماحول اور خصوصاً طلبہ کی انجمنوں (Unions) کے  
الیکشن کے موقعوں پر طوفان بدتمیزی پھا کرنے کا مزاج۔ گزشتہ دنوں تہذیب و تمدن کا گہوارہ  
کہلائے جانے والے شہر لکھنؤ کے نام سے منسوب یونیورسٹی اور اس سے ملحق کالجوں کے ان  
الیکشنوں کے موقع پر جو کچھ دیکھنے میں آیا اور جن ہاتھوں میں قوم قلم و کاغذ دیکھنے کی بجائے  
پر متنی ہے، ان ہاتھوں میں ہتھیاروں کو دیکھا گیا تو ملک و قوم کی فکر کی آخری رمت بھی اگر ختم  
نہ ہوگئی ہو، تو آنکھیں اشکبار ہوئے بغیر نہ رہی ہوں گی۔ وی سی اور پروفیسرز کے گھیراؤ اور  
ان پر پتھراؤ اب معمولات بنتے جا رہے ہیں اگر ملک و قوم کا مستقبل ان دانش گاہوں اور ان  
نوجوانوں سے وابستہ ہے اور یقیناً ہے تو اس پر حساس و باضمیر انسانوں کو حیرت بھی ہونی  
چاہئے اور غیرت بھی آنی چاہئے۔ یہ سب کچھ اس وقت سے ہوا ہے جب دانش گاہوں پر  
سیاست کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے اور نتیجہ میں علم و تعلیم کے ان دیرو حرم کا تقدس نہ  
صرف مجروح ہوتا چلا گیا بلکہ محسوس ہوتا ہے (خدا کرے یہ احساس صحیح نہ ہو) کہ اب تو  
رخصت ہو چکا ہے۔

افسوس کہ موجودہ سیاست نے ہر میدان کو آلودہ کرنا شروع کر دیا اور انتہا یہ کر دی

ك الذی خلق

نام کے ساتھ ہو

ونے والی پہلی وحی میں اللہ نے رسول اللہ صلی  
اور اس زمانہ کے اس ماحول میں دیا تھا جب  
ن یہ آفاقی پیغام تھا اور اسے قیامت تک باقی  
کے آشیانہ سے بلند دکھائی پڑ رہا تھا لیکن اس کا  
غلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔

محال تھی اور کہاں آج کا زمانہ کہ دنیا کو علم کے  
۔ اس کی وسعتوں کا اندازہ لگانا اور اس کی تہا  
ہے کہ علم کی افادیت کو زیادہ مؤثر بنانے کے  
توجہ مرکوز کی جا رہی ہے۔

اور سمتوں کی تعین میں یقیناً مدد کی ہے لیکن  
سے یہ فکر اپنا دامن بچالے گئی ان میدانوں میں  
ملق کہا تھا ع

ہے تھا لیکن اس کے برعکس سیاست دانوں کو  
ربات کو استعمال کرنے میں بھی عار نہیں رہا۔  
کی آلائشوں نے اسے بھی نہیں بخشا تو دانش

ست اپنا قبلہ درست کرے بلکہ علم و تعلیم بھی  
لحق ہے۔

## پاک اور پیارا محمدی انقلاب

دجالی فتنہ اپنے مذموم مقاصد کے لئے کیسے دلکش لیکن کس قدر پرفریب تعبیریں  
وضع کر لیتا اور تراش لیتا ہے (زین لکم الشیطن اعمالہم) (خوش نما کر دیا شیطان نے  
ان کی نظروں میں ان کے اعمال کو) کے مصداق..... ایسی ہی اصطلاحات میں سے ایک  
اصطلاح ”تعمیر نو“ کی آڑ میں (یا شاعر کی روح سے معذرت کے ساتھ) ”تعمیر جنوں“ کے  
پردے میں ”تخریب“ کے جو سامان ہو رہے ہیں، انہوں نے ہر باشعور و غیور انسان اور  
ہر باضمیر مسلمان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہے کہ انسان، جس میں  
خالق و مالک نے مسجود ملائکہ بننے کی صلاحیت رکھی ہے جب منکر ہو جاتا ہے تو اسفل سافلین  
ہو جاتا اور جانوروں سے بھی بدتر بن جاتا ہے ظلم و بربریت کو کس طرح امن و سلامتی کے معنی  
پہنا دئے جاتے ہیں، انسانی خون کس طرح ارزاں ہو جاتا ہے اور کس طرح ننھی ننھی  
جانوں تک کو خاک و خون میں نہلا دیا جاتا اور مقدس و باوقار قائدین تک کے بھی چیتھڑے  
اڑا دینے میں نہ عار محسوس ہوتا ہے نہ دریغ کیا جاتا ہے۔

نام نہاد مہذب و متمدن دنیا کی ”تعمیر نو“ کی مہم کی ایک تصویر یہ ہے..... قتل  
وغارت گری اور جبر و تشدد کی تصویر!!

لیکن ربیع الاول کے اس مبارک مہینہ میں ذرا تصور کیجئے تاریخ انسانی میں اپنی  
نوعیت کی اس بے نظیر و جدا گانہ نئی دنیا کی تعمیر کی مہم کی جو رہتی دنیا تک کے لئے نظیر ہے اور  
رہے گی۔ تاریخ انسانی میں نئی دنیا کی تعمیر کی اس مہم کے نتیجے میں سلامتی، عدل و انصاف

دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں اور اس لئے عائد کئے جا رہے ہیں کہ سچائی کا راستہ روکا جاسکے۔

یہی وقت ہے کہ ہم کتب تفسیر وحدیث اور سیرت رسول ﷺ سے وہ شعور حاصل کریں جس سے مایوسی کی جڑیں کٹتی ہیں اور امیدوں کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ رہے مکر و سازش کے جھگڑ اور انسانی خون کی ہلاکت خیز برکھا، تو تاریخ یہی بتاتی ہے کہ سچائی کا راستہ قدم قدم بلاؤں سے ہی ہو کر گزرتا ہے لیکن مظلوم و مغلوب بالآخر غالب آکر رہتا ہے بشرطیکہ اللہ اور رسول سے خیانت نہ کی جائے اور ان کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہو:

”اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے، مغلوب پڑے ہوئے ملک میں۔ ڈرتے تھے کہ اچک لیں تم کو لوگ۔ پھر اس نے تم کو ٹھکانہ دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تاکہ تم شکر کرو۔ اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے“ (سورۃ الانفال، آیت ۲۷)

”تعمیر نو“ کا راگ الاپنے والے یا ڈھونگ رچانے والے جب بھی مسائل و حالات کا بے لاگ تجزیہ کریں گے اور ان کا ایماندارانہ حل تلاش کرنا چاہیں گے تو وہ حل انہیں نبی رحمت ﷺ ہی کے چوکھٹ پر مل سکے گا۔

ع غبارہ راہ روشن ہے بہ شکل کہکشاں اب تک

اس کا کمزور ترین فرد بھی ظلم سے محفوظ اور ضرر جہاں ﷺ نے عدی بن حاتم سے ایک موقع سن لے گا کہ اکیلی عورت قادیسیہ سے چلے گی نہ ہوگا۔

اس مہم کو جنگوں کے میدان کارزار سے بھی ف نظر کرنا چاہتی ہے کہ بدر، احد، اور احزاب کے جواب اور دفاع میں لڑی گئیں جب کہ حنین میں جنگی قوت کے مرکز تھے اور غزوہ نبی کا استیصال تھا۔ اخلاق کے بجائے تلوار سے بھی صرف نظر کرنا چاہتے ہیں کہ جنگوں کے اللعالمینی جا بجا صاف دیکھی اور محسوس کی جنگ دونوں طرف سے جو موتیں ہوئیں ان میں مشرکین کی تعداد ۷۵۹۷ ہے اور علمبرداران لم جانی نقصان کے ساتھ ایک پاک و بیار اسلامی ریاست کی بنیاد پڑی تو وہ علاقہ تقریباً ۷۵۹۷ میں یہ ریاست دس بارہ لاکھ مربع میل کی جبر و تشدد کیا گیا نہ قتل و غارت گری سے کام لیا ر لایا جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں انسانیت کے خ انسانیت اس حقیقت سے آشنا ہوئی کہ جنگ مقصد اجتماعی مفاد، انسانیت کا تحفظ اور امن ہے جو حقیقت اور انصاف پر مبنی ہے اور امن و آشتی کے علمبردار دین کے نام لیواؤں پر آج

پر مشرکین مکہ کا رویہ آپ ﷺ اور اسلام کے تئیں ہمت شکن رہا مگر یہ رویہ دعوت کے حوصلہ کو پست نہ کر سکا، آپ ﷺ نے اپنے اقرباء و اعزہ کو کھانے پر مدعو فرمایا اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی حضرت علیؓ کے سوا اس پر کسی نے لبیک نہ کہا مگر اس پر بھی وہاں مایوسی کا دور دور تک کوئی گزر نہ تھا بلکہ اب تو کیفیت یہ ہو گئی کہ کبھی حج کے موقع پر مکہ حاضر ہونے والے زائرین کو آپ ﷺ دین کا پیغام سناتے نظر آتے تو کبھی بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں آنے والوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرماتے دوسری طرف آپ ﷺ کی مخالفت میں شدت آتی گئی، ابولہب جیسے لوگ آپ ﷺ کے درپے آزار تھے، ساحر و مجنون کی پھبتیاں کسی جاتیں اور تمام تر کوشش ہوتی کہ آپ ﷺ کی دعوت سننے سے ہی لوگ انکار کر دیں۔

تحقیر و تذلیل، استہزا اور ایذا رسانی کے حربے استعمال کئے جاتے رہے مگر بے سود، دعوت کے سلسلے کو یہ حربے روک نہ سکے، مکہ کی سرزمین جب اسلام کے نام لیواؤں پر تنگ ہوتی نظر آئی اور جینا دو بھر ہو گیا تو آپ ﷺ نے ان کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانکی اجازت مرحمت فرمادی تاکہ امان کے ساتھ وہاں دعوت کے امکانات بھی نظر آسکیں، یاد کیجئے نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن طیارؓ کی اس تقریر کو جس میں اسلام کا جامع اور مؤثر تعارف ہی نہیں، دین فطرت کی دعوت بھی ہے جس نے مشرکین مکہ کی تدبیروں پر پانی ہی نہیں پھیر دیا بلکہ نجاشی کے دل کے تاروں کو بھی چھیڑ دیا، اور بالآخر وہ مشرف بہ اسلام ہوا۔

حالات کی سنگینی کے باوجود داعیانہ کردار اپنی اثر خیزی دکھاتا رہا، طائف کے سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، وہ آپ کے علم میں ہے کہ کس طرح اوباش لڑکوں نے آپ ﷺ کا چچھا کیا اور آپ ﷺ پر پتھر برسائے آپ ﷺ عتبہ و شیبہ کے باغ میں پناہ لیتے ہیں، ان کا غلام عداس آپ ﷺ کی خدمت میں انگور کے خوشے لئے حاضر ہوتا ہے، آپ ﷺ کی پنڈلیاں لہو لہان ہیں مگر اس حال میں بھی عداس (جو نصرانی تھے) کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور عداس حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔

پھر وہ وقت آیا جب مشرکین مکہ کو عتبہ بن ربیعہ نے مشورہ دیا کہ وہ اپنی حکمت عملی

## ایک بے قرار ہستی

یہ دین کے ایک طالب علم اور عالم کا تصور ہی مبلغ نہ ہو، کسی نے برسہا برس اسلام کا مطالعہ کیا کہ پڑھی ہو اور اسکے باوجود بھی اگر اس میں وہ دور ہدایت کے پہونچانے کی صفت کہلاتی ہے علوم اسلامیہ کے خول تک تو شاید ہو گئی ہو مگر علوم کی روح کو اس نے پایا نہیں ہے۔

بیات طیبہ کا سرسری مطالعہ ہی کرے تو بھی اس کے لئے اور اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک ن و مضطرب رہتے ہیں، ایک بے قرار ہستی تھی جیتی تھی، ایک درد تھا، تڑپ تھی، کرب تھا، سوز و اس نے چاہا کہ دوسرے بھی اس کے لذت ہا اور معاشرہ میں ظلمتوں سے نور کی طرف سفر

یہ بتاتا ہے کہ شدید مخالفت کے باوجود ڈھکے تپ رہی، ایمان قبول کرنے والے ان مبارک رہا، پھر کوہ صفا سے آپ ﷺ نے ندا لگائی، اس



لے کر اس کا قاصد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، قاصد کا خیال تھا کہ آپ ہر قل کے خط کی جانب فوراً متوجہ ہو جائیں گے لیکن آپ ﷺ نے اس خط سے پہلے قاصد کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اس سے پوچھا کہ تمہارا تعلق کس قبیلہ سے ہے، جواب سن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اپنے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کے مذہب (جو سچا مذہب ہے) کی طرف مائل ہو؟

اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ کے ان خطوط کو یاد کیجئے جو آپ ﷺ نے مختلف سربراہان مملکت کے پاس ارسال فرمائے ایران کے بادشاہ کسریٰ کے پاس حضرت عبداللہ بن حذیفہؓ کو بھیجا، شاہ عمان کے پاس حضرت عمرو بن عاصؓ کو، قیصر روم کے پاس حضرت دحیہ کلبیؓ کو، غسان کے بادشاہ کے پاس شجاع بن وہب اسعدیؓ کو، شاہ حبشہ نجاشی کے پاس حضرت عمرو بن امیہؓ کو، صاحب یمامہ کے پاس سلیط بن عمروؓ کو اور ہجر کے بادشاہ کے پاس علا بن حضریؓ کو بھیجا، یہ فہرست بڑی طویل ہے اور ان خطوط کی اصل دنیا کی مختلف میوزیم میں آج بھی محفوظ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ داعی اعظم ﷺ نے جو امت پیا کی وہ خیر امت کہلائی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس کی شناخت ٹھہری، ملت اسلامیہ ہندیہ کے سامنے آج سب سے بڑا مسئلہ اپنی شناخت کے باقی اور قائم رکھنے کا مسئلہ ہے لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ جس امت نے اپنی اصل شناخت ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کو فراموش کر دیا ہو اس کے سامنے اس کی شناخت کا مسئلہ تو کیا، اس کے وجود کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا مسئلہ بھی آن کھڑا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اللہ کی اس زمین پر اس کے باقی رہنے کا جواز یہی ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا ڈنکا بجائے۔ اور حضرت ربیع بن عامرؓ کے لفظوں میں بندگان خدا کو بندوں کی بندگی سے خدائے واحد کی بندگی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف بلائے دعوت کا یہ کام نہ صرف ملت اسلامیہ کے وجود و بقاء کا ضامن ہے بلکہ اس میں ہماری تہذیب، ہمارے ملک اور پوری انسانیت کے وجود و بقاء کا راز مضمر ہے، اور ہمیں اپنے ہمسایوں سے جس عداوت کا شکوہ ہے اس مسئلہ کا حل بھی دعوت کے کام میں موجود ہے۔ اللہ توفیق دے اور ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

امت، امارت، حسن اور علاج و معالجہ کی پیشکش بیتیں تلاوت کیں ان کے اخیر میں تھا کہ ”اللہ اور یہ سورج اور چاند ان کو سجدہ نہ کرو جس نے سجدہ کرنے والے ہو“ (سورہ فصلت ۱۴۱: ۵) یہ ساتھیوں کے پاس گیا تو اس کے چہرے کے

مثالی اسلامی معاشرہ اور ریاست تشکیل پائی مرحلہ میں بھی وہ فریضہ دعوت سے غافل نہیں رہی آپ ﷺ کی جانب سے مختلف مقامات پر مقصد سے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مدینہ منورہ بنو لیت کے ایک صحابی کو قبیلہ بنی سعد کی طرف من عوفؓ کی سربراہی میں ایک وفد دومۃ الجندل کیا، حضرت عمرو بن عاصؓ کی امارت میں ایک حضرت خالد بن ولیدؓ ایک جماعت کے ساتھ دعوت لے کر حاضر ہوئے۔ ایک بار جنگی قیدی آپ ﷺ نے ان سے استفسار فرمایا کہ کیا میرے لیے، ان کا جواب نفی میں تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے ساتھ اپنے گھروں تک پہنچا دو اور پھر ان کے سربراہی میں خیبر کی جانب لشکر کو روانہ کرتے یہ بات بھی تھی کہ انہیں پہلے اسلام کی طرف آگاہ کرو۔

خط تحریر فرمایا اس کے جواب میں ہر قل کا خط

پہلی صف میں مسابقت کے پیچھے ایک جذبہ یہ بھی کارفرما رہتا تھا کہ آقاؐ نماز ختم کر کے اپنی جائے نماز پر گھوم کر نمازیوں کی طرف رخ کر لیا کرتے تھے اور صحابہ کرام کی آپ کے رخ انور کو دیکھنے کی تمنا پوری ہو جاتی تھی۔ حضرت جابر بن سمرہؓ کورات کی چاندنی میں آپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان کے دل و دماغ نے گواہی دی کہ خدا کی قسم! آپ کا چہرہ انور چودھویں کے چاند سے زیادہ حسین تھا (شائل ترمذی) ایک طرف کسریٰ کے ایلچی کے کاٹنے کا منظر ہے اور دوسری طرف یہ عالم کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ آپ کے کاندھوں پر سوار ہیں اور آپ اسی حال پر ان کو لے کر گلیوں میں دکھائی دے رہے ہیں اور زبان مبارک پر یہ الفاظ ہیں ”کیا اچھی سواری ہے اور کیا اچھے سوار ہیں“۔

(۳)

ایک طرف کسریٰ کے ایلچی پر رعب طاری ہو جانے کو دنیا نے دیکھا اور جانا دوسری طرف حضرت مصعب بن عمیرؓ کی محبوبیت و شہداءیت بلکہ فنایت بھی دیکھ لیجئے، مکہ کے شہزادے تھے، گیسودراز، نفیس لباس، پیکر جمال، نوجوان ان پرشید اور ان کی نقالی ان کے لئے باعث تسکین لیکن جب انہوں نے جمال کے کمال کے مظہر چہرہ تاباں کو دیکھا تو آپ کے قدموں میں آکر گر پڑے اور ایسا گر پڑے کہ دنیا ہی بدل گئی، عیش و عشرت کے وسائل کو خیر باد کہا اور میلے کچیلے کپڑوں پر قناعت کی حتیٰ کہ جب جام شہادت نوش کیا تو اس سابق شہزادہ کو کفن کا کپڑا میسر نہ تھا، سر ڈھکا جاتا تو پیر کھل جاتے اور پیر ڈھکے جاتے تو سر کھل جاتا، آپ نے فرمایا: سر ڈھک دو اور پیروں پر گھاس ڈال دو۔

(۴)

آپ کی سیرت طیبہ کیا تھی؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ آپ کی سیرت قرآن تھی۔ آپ شعب ابی طالب میں محصور ہیں زمانہ آپ کا دشمن ہو گیا ہے، جان و مال عزت و عافیت سب کچھ داؤں پر ہے اور آپ کا سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا ہے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ آپ نبوت کے دعویٰ سے باز آ جائیں، شعب ابی طالب میں جن شدت

## بار کی چند جھلکیاں

در کا تہ بند پہنے، ایک چادر شانوں پر ڈالے مسجد حاضر ہوا، رعب داب کی وادیوں میں، سونے ان کی کسراؤں کی آغوش عظمت و جلال میں، ی کے زیورات اور جاہ و حشم کے پروردہ کسریٰ کو چادر پہنے ہوئے سرکار کے دربار میں کانپ و شوکت مصنوعی نہیں حقیقی تھی، نگاہیں جھوٹے احد و قہار کے رسول صادق کو دیکھ رہی تھیں۔ ”کہ جس شخص نے آپ کو اچانک دیکھا تو اس نے قریب رہ کر ملا اس کو آپ کی ذات پاک سے بکھڑا تھا اور نہ بعد میں“

نہا، اب آپ کی محبوبیت کی دلکشی و رعنائی بھی نزل ہو کیسی حسین و دلکش دل کے تاروں کو ہوئی دھوپ میں جس طرح لوگوں کو ٹھنڈے رام کو آپ کی ذات پاک کی طلب رہتی تھی۔ فی صورت دلوں میں پیوست تھی صحابہ کرامؓ کی

آقائے نامدار کی بحث انسانوں کیلئے ہوئی تھی اسی لئے آپ کا اسوہ، اسوہ حسنہ ہے۔ آپ کو بھوک بھی لگتی تھی اور پیاس بھی، غزوہ خندق کے موقع پر دنیا نے دیکھا کہ جب سخت بھوک لگی اور خالی پیٹ چلنا دشوار ہو گیا تو شکم مبارک پر پتھر باندھ لیے جب اللہ نے رزق فراہم کیا تو کھجور و گوشت بھی تناول فرمایا۔ عیال کی پرورش بھی کی، مہمان کا استقبال بھی کیا۔ آپ کی مصروفیت کی گواہی قرآن سے ملتی ہے (سورۃ مزمل: ۷) لیکن وہ خاتم العین تھے۔ نبوت کے فرائض آپ پر عائد تھے۔ ناخواندہ قوم کو علم و حکمت سے آراستہ کرنا تھا، قلوب کا تزکیہ کرنا تھا، اللہ کے کلام کو پڑھ کر سنانا تھا پھر باجماعت نمازوں میں امامت کرنا اور راتوں کو اٹھ کر دنیا سے بے نیاز ہو کر نوافل ادا کرنے ہوتے تھے۔ طویل نوافل، نماز پڑھتے تو آپ کے سینے سے ایسی آواز نکل رہی ہوتی جیسے آگ پر رکھی ہوئی ہانڈی کی آواز، سجدے کرتے تو ان میں اتنا وقت صرف ہوتا کہ اتنے وقت میں پچاس آیتیں پڑھی جاسکتیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آپ راتوں میں اتنا رکوع و قیام کیا کرتے کہ آپ کے گھٹنوں میں درم آجاتا۔

(۷)

آپؐ امہات المؤمنین کے حجروں سے ذرا دور ایک بلند جگہ پر معمولی سے حجرہ میں مقیم تھے کوئٹہ میں چند مٹھی جو رکھی تھی، خشک روٹی کا ٹکڑا پڑا تھا، چند کچی پکی کھجوریں تھیں اور آپؐ ایک کھردری چٹائی پر لیٹے تھے جس کے نشانات جسم اطہر پر پڑ رہے تھے حضرت عمرؓ نے یہ منظر دیکھا تو حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رسول کریمؐ نے حضرت عمرؓ کی دلی کیفیت اور بے چینی کو محسوس فرمایا اور ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: اے عمر! دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی وطن سے دور یا مانوس جگہ میں ہو اور سفر کر رہا ہو، کن فی الدنیا کانک غریب اوعا برسبیل، ان الفاظ مبارک کی جلوہ گری حضرت عمرؓ کی حیات مبارکہ میں بھی نظر آتی ہے اور وہ جب خلیفہ ہوئے تو مسجد کی خاک پر پڑے رہتے تھے اور دوسرے ممالک کے اہل بیہ منظر دیکھتے تو کانپ جاتے تھے۔

قرآن نے ان الفاظ میں گواہی دی ہے کہ وہ (سورہ مزمل ۷) ایک طرف تو یہ عالم اور دوسری طرف بے قرار کی پیش کش کہ عیش و عشرت، پاپ پر نثار کرنے کے لئے وہ تیار تھے تاریخ کے قاصر ہے کہ ان دنوں آپؐ نے سوکھی ہڈیوں کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ سیاہ آندھی کا ایک پس ہوئی آپؐ نے پامردی کا وہ ثبوت دیا جس

یہ ایک باب ہے۔ آپؐ نے مختلف موقعوں کی دور رس سے کام لیا اور آپؐ کے قوت فیصلہ، شخص معاملات میں آپؐ نے وقت پر جو فیصلہ روشنی سے محروم رہتی۔ مثلاً بدر کا میدان ہے فیصلہ تہا سرکار دو عالمؐ نے فرمایا۔

اس کو اس میں شکست نظر آرہی ہے مگر دنیا نے فیصلہ کا نتیجہ تھا اس موقع پر غزوہ احد کو بھی یاد کروہ اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ مگر اس کے افراد طرف پڑ گئے اور دشمن اس راستہ سے آکر دشمن فوج کا نشانہ آپؐ کی طرف تھا۔ دندان پڑ چکے تھے اور آپؐ کے محبوب ترین چچا کو نہ لہ ان کے جگر کو چبایا جا رہا تھا کتنا سخت، دشوار نے ثبات میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔

شریعت آپ کے ذریعہ سے آئی، وہ اعلان کر رہی ہے کہ اللہ نے علوم و معارف کے خزانے آپ کے سینہ مبارک میں جمع کر دیئے تھے اور مختصر جملہ میں آپ نے وہ بات فرمادی کہ وہ بڑے بڑے دستور، قانون کی مجلدات کی تصنیف کا ذریعہ بنی اور ان کا سلسلہ جاری ہے۔ شیخ عبدالقادر جحازی نے سچ کہا ہے، جوامع الکلم کے بارے میں جس میں امام ابن قیم کے شاگرد نے پچاس حدیثیں جمع کر دی ہے کہ ”یہ وہ کتاب ہے کہ اگر کوئی اسے سونے کے وزن پر بیچے تو بیچنے والا گھائے میں نہ رہے گا۔“

(۱۰)

آپ کی اطاعت و فرمانبرداری پر سب متفق تھے اس لئے کہ جو دین آپ لے کر آئے اُممیں نہ تو غلو تھا نہ کوتاہی، توسط اور اعتدال، سختی اور نرمی کے بیچ کی راہ ہمیشہ آپ کو پسند رہی، آپ کی تعلیمات میں نہ تو غلو ہے نہ تو بے اعتدالی اور نہ کوتاہی اور نہ تقصیر۔ آپ نے فرمایا کہ دین سے کشتی نہ لڑو ورنہ تم کو چھاڑ دے گا اور گھوڑے کو اتا تیز نہ دوڑاؤ کہ تم منزل تک نہ پہنچ سکو اور گھوڑا بھی مر جائے بلکہ درمیانی راہ چلو، آپ نے اپنے صحابہ کو نہ دنیا طلبی کی طرف مائل کیا اور نہ ترک دنیا کی دعوت دی بلکہ اعتدال پسندی کو حقیقی معیار بتایا۔

(۱۱)

آپ ایک بیقرار ہستی تھے دینی تقاضوں اور نازل شدہ احکام و شریعت کی فکر اور اس کو عمل میں لانا آپ کی خصوصیت تھی۔ شریعت اسلامیہ میں معاشرتی قوانین اور اخلاقی ضابطوں میں اتنا اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اہل کتاب بہت سے معاملات میں اور خاص طور سے میراث کی تقسیم میں ان اصولوں کو اپنائے رہے جو اسلام کی خصوصیت ہے آپ نے فرمایا کہ جو ان احکام کو سن رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ ان لوگوں کو اللہ کا حکم اور شریعت بتادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

(۱۲)

چاروں طرف سے دشمنوں کا گھیرا ہے، ہر شخص آپ کے خون کا پیاسا ہے اور آپ

م کی صفت، غصہ پی جانے اور معاف کر دینے ملے تھا جو کسی بشر میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ فتح لعلہ کے اندر پناہ کا طالب ہو کر آجائے اس کو پناہ لی وہ معاف کیا گیا جس نے اپنے گھر کے موقع پر دشمنان اسلام جمع ہوتے ہیں، آپ کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا، ہے جو ایک شریف شہزادہ، بہترین باپ کے فرمایا کہ میں آج آپ سے ایسی بات کہوں گا جو ج کوئی الزام نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارا قصور بیان ہے۔ (سورہ یوسف: ۲۹)

مزر سے قریش کو معاف فرمادے“ پھر وہ جس نے رسول کریمؐ کے محبوب ترین چچا کا

ما یتیم جس کو کسی مکتب میں نہیں بھیجا گیا اور سات عالم کے کتب خانوں کو (اپنے ایک

مگر آپ کی ایک بات بڑے بڑے کتب پر دنیا نے اپنی اپنی زندگیاں صرف کی ہے اور رب کے امی سے ملا اور راستہ وہی ہے جسے تہی آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، جو

## جب شفیع اعظم کے دل پر چوٹ پڑتی ہے

فارسی کے مشہور شاعر مرزا بیدل کی خدمت میں دور دراز سے ایک وفد عقیدت مندانہ حاضر ہوا دیکھا کہ مرزا داڑھی منڈوا رہے ہیں وفد کے سربراہ نے حیرت و استعجاب سے عرض کیا۔۔۔۔۔ ”مرزا آپ بھی داڑھی منڈواتے ہیں“۔۔۔۔۔ مرزا نے شوخی سے جواب دیا۔۔۔۔۔ ہاں! داڑھی منڈواتا ہوں، کسی کا دل نہیں دکھاتا۔۔۔۔۔ بیدل کا مخاطب بھی شاید کوئی صاحب دل ہی رہا ہو۔ نہایت عاجزی اور بڑی دردمندی سے وہ بیدل سے مخاطب ہوئے اور کہا۔۔۔۔۔ ہاں، ہاں! آپ کسی کا دل نہیں دکھاتے لیکن داڑھی منڈوا کر اور سنت کوڑھا کر اپنے رسول کے دل پہ آئے ضرور چلاتے ہیں!!

دل سے نکلی یہ بات بیدل کے دل پر گری لیکن شاید بجلی بن کر نہیں بلکہ ابر رحمت بن کر۔۔۔ اور انہیں پانی پانی کر گئی، حاضر جوابی اور شوخی کی جگہ ندامت و شرمندگی نے لے لی اور اس نے بیدل کو ایسا بیکل کر دیا کہ داڑھی نہ منڈوانے کا فیصلہ کئے بغیر انہیں چین نہ آیا۔

بیدل کے اس واقعہ کو ذرا ایک بار پھر پڑھئے، بیدل کی یہ بات اگر ہمارے دل پر اثر انداز نہ ہو تو ہمیں خود کے ”بے دل“ ہونے پر شبہ نہ ہونا چاہئے۔!!

اب ذرا دل تھام کر اس بات کا تصور تو کیجئے کہ ہمارے اعمال حضور خیر الانام کے سامنے پیش ہیں۔۔۔۔۔ الا ماشاء اللہ۔ اعمال کی اس گٹھری میں کیا کچھ نہیں ہے، جھوٹ، غیبت، خیانت، حسد، بغض، عداوت، بہتان تراشی، دلازاری، نہ ہماری زبانوں سے کوئی محفوظ، نہ ہمارے ہاتھوں سے کوئی مامون۔ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔۔۔۔۔ دونوں کی

ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کے سوا کوئی مدد نہیں ہے۔  
کے رہے گا اور باطل کو ایک دن گرنا ہی ہے۔  
ہار گئے ہیں اس عالم میں آپ پکار پکار کر کہہ  
ہمت ہارے ہوئے اور میدان سے بھاگے  
آتی ہے آپ حضرت ابو طلحہؓ کے گھوڑے کی تنگی  
:”اے لوگو! تم کس بات سے گھبرائے گئے“۔

(۱)  
ما چیز باقی نہ رہ گئی تھی اور جب آپ کی وفات  
دی کے یہاں ایک صاع جو پر رہن رکھی ہوئی  
کے مالک، علاقہ کے سردار، اس بات کے منتظر  
رہم یادینا نہیں لیا، لباس معمولی اور موٹا جھوٹا!  
کی ایک جھلک، خاتم النبیین کی حیات طیبہ کا  
سلاۃ و سلام کا نذرانہ پیش کرتے رہیں۔

محمد و علی الہ و صحبہ وسلم

فکست دی اور کس طرح ان پرنیکیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

اعمال پر اثر انداز ہونے والے عوامل و محرکات میں اس احساس کو بھی شامل کر لیجئے کہ ہمارے اعمال رسولؐ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ جس امت کے لئے آپؐ نے پتھر بھی کھائے اور پیٹ پر پتھر بھی باندھے اب اس امت کے فرد ہونے کے ناطے فیصلہ خود کیجئے کہ ہمارے اعمال رسولؐ کے لئے راحت کا باعث بنیں یا خدا نخواستہ اذیت و تکلیف کا۔

۔۔۔ بھلا کون بد بخت ہوگا جو اپنے رسولؐ کو اذیت پہنچانے کا تصور بھی کر سکے گا۔ روزمرہ کی زندگی میں ہی اخلاقی قدروں کے زوال کے باوجود آج بھی یہ پاس و لحاظ دیکھنے کو مل جاتا ہے کہ ہماری کسی کوتاہی یا لغزش کا علم کسی ایسی شخصیت کو نہ ہونے پائے جس سے ہمارا عقیدت و محبت کا تعلق ہے۔ کیا رسولؐ مقبولؐ کی ذات اقدس سے بڑھ کر بھی عقیدت و محبت کا حقدار کوئی ہو سکتا ہے۔ تو پھر اس سلسلہ میں کوتاہی کیسی؟ خدا کا شکر ہے کہ اپنے رسولؐ سے محبت تو اس امت کا طرہ امتیاز ہے یہاں تک کہ ایک فاسق و فاجر مسلمان کا دل بھی محبت رسولؐ سے خالی نہیں ہے۔۔۔ لیکن بس خامی یہ ہے کہ ہمارے اعمال محبت رسولؐ کے تقاضوں سے خالی ہیں۔

”رسولؐ کا دل دکھانے کے مجرم ہم بھی تو ہیں۔“ کا احساس اپنے اندر جگائیے، اس صورتحال کو بدل دینے کا فیصلہ کیجئے اور پھر اس کے ثمرات و برکات دیکھئے کہ یہ احساس کس طرح ہمارے لئے ”ریموٹ کنٹرول“ کا کام کرے گا اور ہمیں نیکیوں سے رغبت اور برائیوں سے نفرت دلانے کا موجب بنے گا۔ جس لمحہ یہ احساس ہم میں جاگ اٹھے گا، ہم بھی مرزا بیدل کی طرح بیکل ہوا ٹھیس گے اور دل کی کاپیلاٹ جانے اور من کی دنیا بدل جانے میں انشاء اللہ دیر نہ لگے گی۔

س کا احاطہ کیوں کر ممکن ہو اور اس کے بیان کی صورت حال کی تصویر کھینچی تھی ”یہ مسلمان ہیں مال و کردار کو دیکھ کر رسولؐ کے دل پر کیا کچھ نہ ٹپڑتی ہوگی!!“

اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے پر ہماری شمش میں آنا ہی چاہئے حضرت امام مالکؒ سے سب کرنے والوں کے بارے میں دریافت کیا تو کی زندگی کیا ہے جس کے پیغمبر کو گالیاں دی ہیں عظیم اور ایمان کے عین منافی! لیکن خدا را ذرا بچئے کہ رسولؐ کا دل دکھانے کے مجرم ہم بھی تو دل زبان و قلم سے اس جرم کا ارتکاب کرتے رہا اعمالیوں سے رسولؐ کے لئے قلبی اذیت کا حصہ کیوں نہیں آتا؟

یت کے پہنچانے سے بچ جانے کی کوئی تدبیر بانٹا کہ آپؐ کو خراج عقیدت کے ساتھ ساتھ مسئلہ کا حل ہے۔۔۔ لیکن سوال اس کا ہے کہ غم کیا جائے اور غفلتوں کے عادی اندرون۔۔۔ خوف خدا، آخرت میں باز پرس، جنت کی اعمال پر رب کریم کا فضل و عنایت اور برے روح کے عقائد اور احساسات حضرت انسان۔ جن خوش نصیبوں کو اس کا تجربہ ہے وہی اس کی بدولت کس طرح انہوں نے بدیوں کو

پر محیط ایک ایسی کامل و جامع حیات طیبہ جو رہتی دنیا تک ساری انسانیت کے لئے رہبر و رہنما اور اسوہ و نمونہ ٹھہری! صلی اللہ علیہ وسلم۔ ”غار حراء سے فتح مکہ تک“ ایک ورق کا موضوع نہیں، اس کے لئے کتابیں درکار ہیں، لکھنے والوں نے اس موضوع پر لکھا، لکھنے والے اب بھی لکھ رہے ہیں اور مستقبل میں بھی اس پر برابر لکھا جاتا رہے گا۔ موضوع ہی ایسا سدا بہار اور شخصیت ﷺ ہی ایسی دلاویز کہ کہنے والا نے کہا اور خوب کہا۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر! عرض مدعا یہ ہے کہ بد قسمتی سے ہم مسلمانوں نے جس طرح قرآن کی تلاوت ہی کو کافی سمجھ لیا ہے اور قرآن کو سمجھ کر پڑھنے اور اس میں تدبر کرنے کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا ہے بس اسی طرح جس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ قرآن پاک نازل ہوا، ان کی سیرت پر بھی میلاد کے کچھ جلسے منعقد کر لینے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس میں اصل ہے ”فقہ السیرۃ“، صلی اللہ علیہ وسلم! حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غور و خوض کرنے کا ذہن بنانا اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں مسائل کے حل کے لئے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت و روشنی حاصل کرنے کا مزاج اور ذوق پیدا کرنا اصل ہے۔ جس دن امت اپنے تمام تر مسائل کے حل کے لئے قرآن و سنت اور سیرت رسول کی طرف رجوع کرنے کا ذہن و مزاج بنا لے گی اور عملی طور پر اسے اپنا ہادی اور رہبر و رہنما تسلیم کر لے گی، وہ دن اس کے لئے کامیابی کی شاہراہ پر چل پڑنے کا دن ہوگا۔

جس طرح قرآن یہ فریاد کر رہا ہے کہ اسے طاقتوں پر سجا کر اور آنکھوں سے لگا کر نادان ملت یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ وہ قرآن کا حق ادا کر چکی اس طرح سیرت بھی آج شکوہ کر رہی ہے کہ اس میں غور و فکر اور تدبر کرنے کا کام اس طرح اور اس پیمانہ پر نہیں ہو رہا ہے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ آزمائشوں سے گھری، اندیشوں میں گرفتار اور سازشوں کے زرخیز میں آپڑی ملت کے لئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے حیات طیبہ کی طرف اسی تڑپ اور اسی یقین و اعتماد کے ساتھ رجوع کرے جیسا کہ سخت دھوپ میں ریگستانی صحرا کا ایک جاں بہ لب مسافر پیاس کی شدت سے بے قابو ہو کر چشمہ صافی کی طرف قدم بڑھاتا اور لپکتا ہے۔

## مد علیہ وسلم کی فریاد

کہا جائے کہ وہ دور نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے سے اس دور کی تاریخ کا ایک حد تک احاطہ..... ”غار حراء سے فتح مکہ تک“..... سچی بات یہ سفر کا احاطہ ہو جاتا ہے بلکہ اس سفر کے نشیب اور خصوصیات اسلامیت کا قافلہ اپنی زندگی کی۔ گویا ”غار حراء سے فتح مکہ تک“ کا عنوان ایک بلکہ اس سے تاریخ سازی کا کام بھی لیا جاسکتا عمل راہ بھی ہے، لائحہ عمل بھی ہے اور حکمت عملی رہنمائی موجود ہے اور بغیر کسی مبالغہ اور تکلف فتح مکہ تک“ کی روشنی میں ایک مہذب انسانی خاکہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔

م کو آخری نبی بنایا، آپ کو خاتم النبیین ٹھہرایا۔ مختلف مراحل اور مختلف کیفیات و حالات کی ہیں اور دفاع کی بھی، حالت امن کی بھی اور غیر معتدل حالات کی بھی، اپنوں سے واسطہ دیوں میں جاں نثاروں کے حلقے بھی ہیں اور اور اندیشے بھی۔ گویا انسانی زندگی کے گوشوں

## پیغمبر صحراء کو سرزمین ہی پتھریلی عطا کی گئی تھی ضرورت مایوسی کی نہیں، حرارت ایمانی کی ہے

ایک مجلس میں جناب مولانا قمر الزماں صاحب اعظمی نے بڑی اچھی بات سنائی، کہ انہوں نے جب ایک نو مسلم کو قبولیت اسلام پر مبارکباد پیش کی تو اس کا جواب بڑا حقیقت پسندانہ تھا، نو مسلم نے کہا کہ آپ مجھے آخر کس چیز کی مبارکباد دے رہے ہیں، ہرچہ تو دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اس لئے صحیح تو یہ ہے کہ میں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے بلکہ اپنے آپ کو دریافت (Discover) کیا ہے، یہ ہے وہ سچ جو اسلام کو درپیش صورتحال سے متعلق ہے نہ کہ وہ پروپیگنڈہ جو اسلام مخالف ہے کہ اسلام خطرہ میں ہے۔

اسلام سے وابستگی کی وقتی و عارضی آزمائشیں ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں، تاریخ اسلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس راستہ میں ”قدم قدم بلائیں“ ہیں۔ انبیاء کی تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے، ان کے لئے تبلیغ دین کے تئیں جن مختلف سرزمین کا انتخاب کیا گیا عموماً وہ نرم تھیں، لیکن خاتم النبیین ﷺ کو جو سرزمین بخشی گئی وہ سخت تھی، پتھریلی تھی اس پر مستزاد یہ کہ وہاں کے مکینوں کے دل بھی نرم نہ تھے چنانچہ آپؐ نے پتھر بھی کھائے لیکن پھر بھی دعائیں دیں اور اپنی خداداد معلمانہ شان تربیت اور نالہ نیم شمی سے ان پتھروں کو آبگینہ بنا دیا۔

ایک بات امت کی توجہ چاہتی ہے کہ ”الیوم اکملت لکم دینکم الخ“ کی آیت کریمہ کے نزول اور اللہ کی طرف سے دین کی تکمیل کے اعلان کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے آخر صحابہ کرامؓ کو کیونکر یہ تلقین فرمائی کہ جو موجود ہے وہ غائب تک اسلام کے

حالات کی سنگینی ہے اور دوسری طرف ہماری اس لحاظ سے بھی آزمائش ہے کہ ان میں سچا تو فیصلہ ہو جائے اور خاکم بدن ایمان کا محض ولو اتستبدل غیر کم ثم روگردان ہو جاؤ تو وہ تمہارے بدلے تمہارے“ (الامان والحفیظ)



روح، اپنی روایات اور اپنے تشخص کے ساتھ گئے چنانچہ وہ روم بھی گئے، ایران بھی گئے مصر بھی پہونچے جہاں کی اپنی اپنی تہذیبیں تھیں اور دل و دماغ پر ان تہذیبوں کا تسلط تھا لیکن صحابہ کرام اللہ کے رسولؐ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے انسانوں کو ہی نہیں فلسفہ کو بھی مسلمان کر دیا اور نظریہ کو بھی اسلامی قالب میں ڈھال دیا۔ یہ قوت و تاثیر اسلام ہی کی ہے کہ وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ اثر انداز ہوتا ہے۔

دعوت اسلام اور اشاعت اسلام کے سلسلہ میں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ داعیان اسلام نے اصل آبادی کو کبھی نیست و نابود نہیں کیا جب کہ خود کو مہذب و متمدن کہنے والی قوموں کی تاریخ کا معاملہ اس کے برعکس رہا ہے، چنانچہ آج Red Indians کا وجود کہاں ہے؟ لیکن اس کے برعکس حاملین قرآن اور داعیان اسلام کو صحراؤں نے راستے دئے، اور بحر ظلمات میں انہوں نے اپنے گھوڑے دوڑا دئے۔

ایک مثال محمد بن قاسم کی ہے اگرچہ وہ فاتح بن کر اس ملک میں داخل ہوئے تھے لیکن انہوں نے اپنی رعایا کے دلوں کو جس انداز سے جیتا اور یہاں سے محمد بن قاسم کی واپسی کے نتیجہ میں عوام میں جو صف ماتم بکھی اس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔ دراصل محمد بن قاسم کی عقیدت و محبت نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

ایران و افغانستان سے ہوتا ہوا مسلمان ہندوستان آیا اپنے دین و تمدن، اپنی تہذیب و روایات، اپنے اقدار و تشخص کے ساتھ آیا اور اسے اب تک سینہ سے لگائے ہوئے ہے ان امانتوں کو چیلنج ماضی میں بھی رہا ہے، اور آج بھی ہے، اور اس کے خلاف ذرائع ابلاغ کے اس دور میں پروپیگنڈہ زوروں پر ہے، ایک بات خصوصیت کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہے کہ ماضی میں اسلام بھی دوسری تہذیبوں کی طرح اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا، چنانچہ ”ہر عروج کو زوال ہے“ کے اصول کے تحت اب اسلام کا زوال بھی کوئی انہونی بات تو ہے نہیں لیکن اسلام اور اسلامی تہذیب اور دیگر تہذیبوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر کا سانچہ آسمانی ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خالق کائنات نے اپنے ذمہ

و مسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ دعوت اسلام کو دیا جاتا ہے کہ اسلام صرف طاقت کے زور پر نہیں اس کی نفی کرتی ہے مظلومیت اور بے بسی کے ہا۔ تاریخ میں ہر قل کے دربار میں پیش ہونے کے اسلام سے منھ موڑنے سے انکار کرنے کی را سیر ہونا گوارا کیا اور زنداں میں اس پر آب و امپیس کے بالکل قریب ہونے لگا، تو ہر قل سامنے خنزیر کا گوشت اور شراب پیش کیا اور کہا ”تو یہ تمہارے لئے حلال ہے! لیکن اس قیدی ری اور ایمانی قوت کی مظہر ہے کہ اس صورت ت بخشے گا، بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بلکہ ہر قل سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، اٹھے اور ان کے بس ہو سکتا، نتیجہ میں وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے، تاجروں کی ایک کشتی غرقاب ہو گئی لیکن وہ کسی نے میں کامیاب ہو گئے، حالت ناامیدی کی تھی کے دوبارہ سفر شروع کر دیں گے لیکن وہ سچے باشندوں کو ایسا متاثر کیا کہ آج دنیا کے نقشہ پر جن کرا بھر آیا ہے، ادھر اسپین میں مسلمانوں کی اور ادھر انڈونیشیا میں اسلام طلوع ہو رہا تھا، ساتھ نہیں بلکہ ”جو حاضر ہے وہ غائب تک“ قرآنی کوسینہ میں اتار کر اور اس کو بنی نوع بنا کر! اس طرح جہاں بھی وہ گئے اپنی مرکزی

پروپیگنڈہ خصوصاً جہاد مخالف پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کی روشنی میں جہاد کا تقابلی مطالعہ شروع کیا اور خود اس کا بیان ہے کہ جب اس نے ”الجہاد فی الاسلام“ نامی کتاب کا مطالعہ کیا تو اس کی ذہن کی گرہیں کھل گئیں اور جو شخص اب تک عیسائیت کا داعی تھا، وہ آج اسلام کا نہ صرف مدعی ہے بلکہ اسلام کی دعوت کی تڑپ اسے بے قرار کئے ہوئے ہے۔

زمانہ منتظر ہے اس زندہ قوم کے لئے جو اسلام کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے اس صورت میں ع تو دانی حساب کم و بیش را ضرورت مایوسی کی نہیں، حرارت ایمانی کی ہے!!

ب، یا تو انسانی ذہنوں کی اختراع تھیں یا پھر ان کا سلسلہ ابتدائے اسلام سے رہا ہے ابو جہل واقف نہیں لیکن دنیا نے دیکھا کہ سچائی میں ہے کہ سچائی کے سامنے وہ دم توڑ دے۔ اس کی قیدی تشدد کا نشانہ بنے اور زنداں کی صعوبتیں دہوئے تو ہزاروں کو شرک و بت پرستی سے بھی نئے تو تصویر کا یہ محض ایک رخ ہے کہ مسلمانوں اور اس کی اشاعت کی جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا یہ تبلیغی سفر برابر جاری رہا۔

دن کی داستان بزبان حال کہہ رہی تھی کہ اب فتح قوم کے دلوں کو فتح کر لیا اور صنم خانہ سے

جو دعوت و عزیمت سے بھری پڑی ہے، مسئلہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم خود واقعی مسلمان ہیں لے اس معیار پر پورے نہیں اتر سکے، جو اللہ اور خطرہ میں ہے، رہا اسلام تو وہ قیامت تک باقی باؤ کو دخل رہا ہے نہ لالچ کو بلکہ اس کی حقانیت طرہ میں قدرت نے لچک دی ہے یہ اتنا ہی بعد کے حالات اور وہاں قبولیت اسلام میں۔ رشدی جیسے شریپندوں کی حرکتوں کے لطن پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں لوگوں میں اسلام سے ی حال میں ایک پادری نے اسلام مخالف

وہ ساحل پر بیٹھ کر محض نظارہ کرنے والوں میں سے نہ تھا، حق بات کہنے میں اسے کوئی عار نہ تھا اور نہ کوئی مسلکی عصبیت اس کو مانع تھی وہ آفاقی اسلام کا نقیب تھا، اور ہر مختلف مکاتب فکر کے علماء کی موجودگی میں وہ بڑے باوقار انداز سے اٹھا اور اس نے ایک بات کہی!

خدا لگتی بات!!

تقاضہ سے میل کھاتی بات!!

اور مشترکہ پلیٹ فارم کی روح سے ہم آہنگ ایک بات!!!

اس نے کہا ایک ایسے پلیٹ فارم پر جہاں مختلف مسالک و مشارب کے علماء ہوں ان کے لئے نقطہ اتحاد کی بنیاد ”کتاب و سنت“ ہو سکتی ہے نہ کہ کسی بڑے سے بڑے عالم دین کی کوئی بات یا کتاب! ان کی عظمت سر آنکھوں پر! ان کی خدمت کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف!!

لیکن مشترکہ پلیٹ فارم کے لئے تو بنیاد کتاب و سنت ہونی چاہئے یہی وہ دو چیزیں ہیں جو اللہ کے رسول امت کے درمیان چھوڑ گئے تھے اور آپ ﷺ نے یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے کتاب و سنت کے وقار، اس کی عظمت و تقدیس اور اس کے جلال و جمال نے اپنی تاثیر دکھائی چنانچہ نوک جھونک کے بجائے سنجیدگی و متانت کا ماحول بن گیا اُسی شب ایک دوسرے مکتب فکر کے عالم سے ملاقات ہوئی جو اس میٹنگ میں موجود تھے اور واقعہ کے چشم دید گواہ تھے ان پر اس واقعہ کا غیر معمولی اثر دیکھا انہیں مذکورہ بالا عالم کی حق گوئی کو سراہتے ہوئے دیکھا حاشا وکلا، کسی کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ کتاب و سنت کی عظمت پیش نظر ہے اور یہ عظمت ہر کلمہ گو کے دل کے نہاں خانے میں موجود ہے چاہے وہ کسی مسلک و مشرب سے تعلق رکھتا ہو! تو ضرورت ہے کہ تعلیمات کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت پر توانائیاں لگادی جائیں اس لئے کہ اس صورت میں گمراہی سے بچنے کی ضمانت کسی اور نے نہیں بلکہ رسول صادق و امین ﷺ نے دی ہے جس کتاب و سنت کے محض نام میں اس قدر تاثیر ہو اس پر اگر مسلمان واقعی عمل پیرا ہو جائیں تو وہ صالح انقلاب برپا ہو کہ انسانیت جس کی متقاضی ہے!!

## محض نام کی تاثیر

سہ کی کوئی میٹنگ ہو رہی تھی طویل عرصہ سے زیری کا مسئلہ تھا، ملت کے علماء ربانین، قائدین روح ہوا لیکن مسودہ کے الفاظ کے پیچ و خم میں سب پر لطیف نکات بیان کئے جانے لگے اور دقیق ایک نامور عالم ربانی کی ایک کتاب تھی بلاشبہ مکرے کا جو عصبیت سے پاک ہوگا اس لئے اس کی اپنی جگہ اہمیت و افادیت مسلم ہے اور اس بجا طور پر یہ مصرعہ ان پر صادق آتا ہے کہ

س کی نظر سے پیدا

اس کا مشترکہ پلیٹ فارم ہونے کے نتیجے میں مع میں شریک تھے بحث کا سلسلہ چلتا رہا، بات روح بحث پھر بحث ہے وہ آگے بڑھتی ہے تو کی کن کی؟ علماء کی!

س ہیں واعظ کی چالیں

نہیں ہوتا مگر فکر ضرورت ستاتی ہے اور ایسی رائی“ سے کم نہیں ہوتی لیکن علماء کی اسی مجلس، لیکن محض تماشا ہیں بنارہنا اس کا مزاج نہ تھا،

طبیعت کی بشاشت کا اثر اس کے فن پر بھی ظاہر ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اگر یہ سکون مجھے بھی میسر آجائے تو پھر آپ دیکھئے گا کہ میری آواز بھی کیسا جادو جگاتی ہے!

بظاہر یہ ایک لطیفہ ہے لیکن اس میں زندگی کی ایک حقیقت اور کامیابیوں کا ایک راز پوشیدہ ہے جن سے نظریں چرانا حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ قصہ صرف ذہنی تناؤ اور دباؤ سے آزاد ہونے پر ایک گلوکار کی آواز کی مٹھاس کا نہیں ہے بلکہ یہ تو شعر کا مصرعہ اولیٰ ہے اس کا مصرعہ ثانیہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے برعکس صورتحال پیش آنے پر تلخی اور بیزاری کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ افسوس کہ آج ہمیں اس کا تو شکوہ ہوتا ہے کہ کام کے افراد نہیں ملتے اس بات سے سرے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن نہ صرف یہ لطیفہ اس کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ ماضی قریب ہی میں حضرت تھانویؒ، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہ نے جس خوئے دل نوازی سے مردم سازی کی کامیاب کوششیں کیں، ان سے بھی اس قسم کے شکوہ کی نفی ہوتی ہے، ماشاء اللہ پرسنل لاء بورڈ کے صدر نشین بھی اس کی ایک قابل تقلید مثال ہیں۔

رہی بات تناؤ کی، تو یہ مرض وبا کی شکل اختیار کر چکا ہے، اور رہی بات کام کرنے والوں کی اور ان کی راہ میں دانستہ پیدا کی جانے والی دشواریوں کی، تو اس سے بھی ملت کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ نے اپنے مرض الموت کے ایام میں جو نعت کہی تھی اور جو وصال کے بعد ان کے سر ہانے ملی تھی وہ محض ایک نعت نہیں ہے بلکہ ان کے درد و کرب پر مبنی تاثرات و کیفیات کی ایک تاریخ بھی ہے۔ وہ صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہ ”شکستہ کشتی ہے تیز دھارا نظر سے روپوش ہے کنارہ“ دربار نبوتؐ میں یوں سلام پیش کرتے ہیں۔

نبی اکرمؐ شفیع اعظمؐ دکھے دلوں کا پیام لے لو

تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو

تناؤ کے عوامل اور محرکات مختلف ہوتے ہیں اس دوران انتشار میں اس سے مفر ممکن نہیں معلوم پڑتا، اب رہے اجتماعی نوعیت کے کام، تو چونکہ علی العموم اجتماعی تعمیر و ترقی کو ترجیح دینے

## ن دنیا کے نام کا ایک پیغام

یہ لطیفہ سے علاقہ رکھتے ہیں جن کی حیثیت موصوف نے شہر کے منتخب افراد کو اس عنوان پر رکریں اور مسائل کے حل کی تدابیر سوچیں۔  
ان نے ان سے پوچھا کہ آپ کو ناولوں کو پردہ تصور کو حسین و دلکش بنانے کا خیال کیسے آیا تو ملت کی پھوٹی قسمت پر غور کرنے کی توفیق ملتی تصادی صورتحال پر غور کرنے کی باری آئی تو گلوکار کے ہمراہ بذریعہ کار سفر کر رہا تھا۔ سبھی کی عملی شکل اختیار کر گیا ہے جا بجا ٹینک سوچ اس کیفیت اور تاثر کو نفسیاتی طور پر کم کرنے نے لگے۔ اسی دوران انہوں نے اپنے ہمراہ اس گلوکار نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا پوچھا: کیا مطلب؟ تو جواب میں اس نے ہر قسم کے ذہنی تناؤ سے آزاد ہے اور اس کی

## ماہ رمضان کا استقبال

شعبان کا مہینہ پورا ہوا چاہتا ہے اور نیکیوں کے موسم بہار رمضان المبارک کی آمد آمد ہے..... مبارک کہ رحمت و مغفرت اور جہنم سے خلاصی اور نجات حاصل کر لینے کا مہینہ ہم پر سایہ فگن ہونے جا رہا ہے۔ یہ وہ مبارک موقع ہے جس کے لئے ہم اللہ کے شکر گزار بھی ہوں اور اس سے توفیق بھی طلب کریں کہ ماہ رمضان کی عظیم نعمت کی ہمیں قدر نصیب ہو نیز یہ مہینہ ہمیں اپنی برکتوں سے مالا مال کر کے جائے اور خدا نخواستہ ہم اس کی نعمتوں سے محروم و تہی دامن نہ رہیں۔ اس مہینہ کو اگر ہم نے راضی کر لیا تو امید ہے کہ ماں سے ستر درجہ زیادہ شفیق و مہربان اور کریم آقا بھی ہم سے راضی ہو جائے گا، خدا کی رحمت کے برسنے اور لٹنے کا زمانہ آگیا، اب یہ ہماری دل کی کھیتوں پر موقوف ہے کہ وہ زرخیز ہیں یا خدا نخواستہ بخر..... گلشن گلشن پھول کھلے ہوں گے، اور یہ ہم پر منحصر ہوگا کہ ہم اپنے دامن مراد کو کتنا بھرتے اور سعادتوں اور برکتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

اس داتا کی بھی عجب اور نرالی شان ہے کہ وہ مانگنے سے خوش ہوتا ہے اور نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے۔ اپنے بندہ سے شہ رگ سے زیادہ قریب، سمیع و مجیب اور ٹوٹے دلوں کے پاس رہنے والا وہ کریم رب تو ہر لمحہ اور ہر ساعت سب کی سنتا اور مانگنے والوں کو عطا کرتا ہے مگر اس مہینہ میں اس کی رحمت جوش میں ہوتی ہے..... اگر خدا نخواستہ ہم ہی ہوش میں نہ ہوں اور غفلت سے مدہوش ہوں تو اسے بدبختی کے سوا اور کیا کہا جائیگا..... بس ذرا تھوڑی دیر کے لئے تصور کر لیجئے اپنے ان اعزہ و اقرباء اور اپنے ان دوست و احباب کا جو گذشتہ رمضان میں ہمارے ساتھ اور اللہ کی اس زمین پر ہماری طرح چل پھر رہے تھے، زندگی جی رہے تھے لیکن آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اس تصور سے اگر ہماری آنکھیں نم ہو جائیں اور دل غم سے

اجتماعی کاموں کا راستہ زیادہ پر خطر اور خاردار  
یاست کے مظاہرہ کی ضرورت پیش آنے لگی  
لمومیت پر رضامند ہو جاتے ہیں بلکہ زیادہ صحیح  
(فصیح جلیل) کے نسخہ سے وہ اپنے زخم پر مرہم  
صدق کی جو پاکیزگی ہے، وہ انہیں جانب منزل  
سنگ و خشت، چنانچہ دل ضرور ٹوٹتا ہے لیکن  
سوہ یوسفی پر رہتی ہے۔ ﴿انہ من یتق  
نین﴾ (یوسف/۹۰) جو بھی پرہیزگاری اور  
اپنے درد کا درماں ڈھونڈ سکتی ہے۔ آج کے

## رمضان کے بعد چھٹی نہیں!

### اطاعت رب کا تقاضہ عمر بھر کے لئے ہے

اللہ اللہ! یہ فخر و مباہات اور یہ نوید جاں فزا! ذرا تصور تو کیجئے کہ عید کا دن ہے اور اللہ رب العزت اپنے نیکو کار روزہ دار بندوں پر فخر و مباہات کرتے ہوئے فرشتوں سے کہہ رہا ہے..... ”اے فرشتو! بتاؤ اس مزدور کو کیا اجرت دی جائے جو اپنا مقررہ کام اچھی طرح انجام دے“ اور فرشتے عرض کر رہے ہیں..... ”اے اللہ! اس کا صلہ یہ ہے کہ مزدور کو پوری پوری مزدوری دی جائے“..... پھر آپ عید کی نماز کے لئے گھر سے نکلتے ہیں، راستوں کے کنارے پر فرشتے کھڑے نوید سنار ہے ہیں..... ”اے مسلمانو! رب کے پاس چلو جو بڑا کریم ہے، تم نے تراویح پڑھی، تم نے روزے رکھے اور اپنے رب کی اطاعت گزاری کی تو اب چلو اپنا انعام لے لو.....“ اب عید کی نماز ہو چکی ایک فرشتہ اعلان کر رہا ہے..... ”اے لوگو! تمہارے رب نے تمہاری بخشش فرمادی پس تم اپنے گھروں کو کامیاب و کامران لوٹو..... عید کا یہ دن انعام کا دن ہے۔“

یہ کس بات کا صلہ ہے:

ذرا غور تو کیجئے کہ یہ انعام آپ کو کس کام کی بدولت حاصل ہوا۔ آپ نے اپنے رب کے حکم پر بھوک پیاس کی مشقتیں اٹھائیں، اپنے رب کے حضور رکوع و سجود کی صورت میں اپنے بیتاب جذبہ زندگی کے مظاہرے کئے اور رات کے پچھلے پہر اپنے مالک و آقا سے سرگوشیاں کیں اور اپنی خطاؤں اور لغزشوں پر غفور و درگزر کرنے کے لئے آہ و زاریاں

سنا باتیں سب کچھ آپ کو یاد آ رہا ہوگا، ان جانے والوں کا حق ہے کہ ہم ان کے لئے مغفرت و بیعت کے ساتھ کیجیے پھر رکھ کر تھوڑی دیر کے سال بھی آئے گا لیکن خود ہم ہوں گے بھی یا رے لئے دعائے مغفرت کی جارہی ہوگی؟؟ سے رخصت ہو جانے والوں کے لئے ہم آج میں کہ آنکھیں پھلک رہی ہیں جانے والے کے لئے عمل کا موقع ختم ہو چکا۔

س کی مہلت ہمارے لئے تو باقی ہے! خدا کے قیامت، اپنے انجام اور اپنی آخرت کی فکر کا بیج بار لانے کے خوب خوب مواقع ہیں کہ رمضان ملک رہا ہوگا، بلکہ رحمت و مغفرت کی گھٹائیں گناہوں کی کثافتوں سے خود کو پاک و صاف کرنے کی طرح دھل جائیں جو ہر داغ سے آزاد اور نئے کے ابر کرم کے جھوم جھوم کے برسنے کا زمانہ دھونے اور مٹانے کا وقت آ گیا..... دل کے دست قرآن کی بدولت دل کا زنگ بھی دور ہوگا ایمانی و روحانی اور نورانی ماحول کہتے ہیں۔ خدا رنگ جائیں جو اللہ کا رنگ ہے۔

له صبغة ونحن له عبدون)

ہے) اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے؟

## ماہِ صیام اور یہ محرمیاں!

نیکوں کا موسم بہار ماہِ صیام ایک بار پھر ہم عاصی اور خطا کار بندوں کے لئے رحمت و مغفرت اور دوزخ کی آگ سے خلاصی کا سامان لئے جلوہ گر ہے۔ اللہ جزائے خیر دے ان صلحاء و عارفین کو جو یہ نکتہ بھی سمجھا گئے اور یہ راز بھی بتلا گئے کہ اس ماہ میں جس کو نیکی و عبادت کی توفیق حاصل ہوگئی وہ سال رہے اس توفیق سے بہرہ مند ہوتا رہتا ہے اور اگر خدا نخواستہ کوئی مسلمان اسی ماہ میں نیکی و عبادت کی توفیق سے محروم رہ گیا، تو پھر سال بھر اسکے حصے میں محرومی ہی آتی ہے۔ اور عبادت و نیکیوں سے اس کا دامن خالی رہتا ہے۔ اس لئے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنہیں یہ مہینہ میسر آئے اور اس مہینے کی سعادتیں و برکتیں اس کے حصے میں آئیں جن کو نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ روزہ رکھنے، تراویح و نوافل پڑھنے، صاحبِ نصاب ہونے پر زکوٰۃ ادا کرنے، صدقہ فطر دینے اور اس کے ساتھ اس ماہ میں نازل ہونے والی کتاب ہدایت قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی توفیق ہو۔

اس ماہ کے فضائل و مسائل پر قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں لکھنے والوں نے لکھا اور خوب لکھا، مسلمانوں کی دین سے عموماً دوری اور انحطاط کے باوجود آج بھی ماہِ رمضان کا مسلمانوں میں احترام نمایاں طور سے دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ رب کریم اس میں اضافہ فرمائے لیکن اس ماہ سے متعلق دو ایک باتیں ایسی بھی ہیں جو مسلم معاشرے میں پنپ رہی ہیں اور جو طبقہ علماء ہی کے لئے نہیں بلکہ ایک عام درد مند مسلمان کے لئے بھی باعثِ تشویش ہیں۔

نے اپنے دلوں کو منور کیا، زکوٰۃ و صدقہ فطر کی رسائی کا فریضہ انجام دیا اور یہودہ اور بیکار کچھ آپ نے اپنے رب کی خوشنودی کے لئے قاکو آپ پر کیوں نہ پیارا آئے اور عید کے دن کی خلعت کیوں نہ پہنائے!!

وں بجا لیکن اب اس کی فکر کیجئے کہ چاہتوں کی... مبارک کہ آپ نے اس ماہ مبارک میں ہے جس کا نرالا دستور یہ ہے کہ سبق یاد کرنے صول کی آپ نے روزہ میں پاسداری کی، وہ کے لئے ہے۔

ہوتے ہوئے بھی ایک دانہ آپ نے حلق سے نہ کی تاخیر آپ نے نہ کی اس لئے کہ رب کا یہی باوجود وہ کام کیجئے جس میں رب کی خوشنودی جائیے جس میں ذرہ برابر بھی اللہ کی ناراضگی کا بائے بلکہ آپ کا یہ مزاج بن جائے تو سمجھئے کہ س ہوا، پھر خدا کی شان کریمی سے اس کی توقع جس طرح خوشخبریاں سنائی گئیں، زندگی بھر اس..... یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی

لادی و ادخلی جنتی

شعائر کے لئے انکے دلوں میں پائے جانے والے احترام کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔ یہ مبارک مہینہ گویا بیرومیٹر ہے جس سے موجودہ مسلم معاشرہ کے دینی شعائر اور دینی بیداری اور دینی شعائر سے ان کی وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر یہ پیمانہ اور کسوٹی صحیح ہے تو پھر مذکورہ بالا کوتاہیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم خود فیصلہ کریں کہ دینی شعور کی بیداری اور دینی شعائر سے وابستگی کے لحاظ سے ہمارا مسلم معاشرہ آج کہاں کھڑا ہے؟

شروع رمضان کی پانچ چھ راتوں میں ایک ختم سے چھٹی!! لکھو میں یہ منظر تو راقم نے اپنی اوی نے اس سے آگے کی بات کہی کہ وہاں تو شب کی نماز تراویح ہی میں ختم قرآن ہو گیا۔ جواتا ردیا گیا۔

ء کا کام ہے، راقم کا یہ مقام نہیں لیکن کہنے کی سنہرے موقع کو کھودینا آخر کون سی دانائی ہے، (ایمان احتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں کے بھی سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے“ نے میں عموماً تو قرآن پاک کے پڑھنے کا حق خشوع و خضوع ہی نماز کی روح ہے۔ جبکہ اس ایک رسم کی ادائیگی اور خانہ بدی رہ جاتی ہے۔ بات نام و نمود کے لئے دی جانے والی افطار فضیلت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟ آپ سی روزہ دار کو افطار کرادیا، کسی مجاہد کو جہاد کا ار اور مجاہد کے مثل ہی ثوب ملے گا (شعب کم کسی کی نیت پر شبہ کرنے والے کون ہوتے یئے کہ سیاسی پارٹیوں اور شخصیتوں کی طرف شخصیت کو مدعو کرنا کہاں تک مناسب ہے؟ کے برعکس افسوس کہ عموماً افطار پارٹیاں“ ایک لرتی ہیں۔

شعائر کی پابندی و وابستگی کو جانچنے اور ان



شناسی کا احساس ہی اس موذی مرض سے سماج کو نجات دلا سکتا ہے۔ اسلام میں آخرت کا تصور اور ہر چھوٹے بڑے عمل کی باز پرس کا تصور اور احساس ہی وہ احساس ہے جو انسانی سماج کے بگاڑ کو بناؤ سے بدل سکتی ہے۔ قرآن انسان کو یاد دلاتا ہے ”فمن يعمل مثقال ذرة خیرا یدرہ ومن یعمل مثقال ذرة شر ایدرہ“ (۷:۹۹) حاصل یہ کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور بدی بھی اللہ کی نظر سے بچ نہیں سکتی۔

ڈنڈی مارنے کے عمل نے انسانی معاشرہ سے حلال و حرام کی تمیز کو ختم کر دیا ہے، چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ دو تین ہزار کا ایک عام ملازم بھی گاڑی اور کٹھی کا مالک بنا بیٹھا ہے جیسے اچانک الہ دین کا چراغ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو اور لطف یہ ہے کہ تسبیح بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹی..... ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

نماز روزہ کو آڑ کی ٹٹی بنانے والوں سے اللہ کی پناہ! دین کو بھی بدنام کیا ہے اور اس کے نام پر قائم اداروں پر نقب بھی لگائی ہے.....

آخرت کا تصور اور روز جزا کی باز پرس، جس ملت کا بنیادی عقیدہ ہو، افسوس کہ دنیا کی چند روزہ ظاہری چمک دمک اس کی نگاہوں کو ایسا خیرہ کر دیتی ہے کہ انجام اور خدا کی گرفت سے وہ پوری طرح غافل ہو جاتا ہے ورنہ یہ دنیا تو تماشہ گاہ ہے، اور عبرت گاہ بھی، چنانچہ یہاں روز ایسے روح فرسا اور عبرت ناک واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ ایک شخص یا ایک بستی رات میں کھرب پتی تھی، وہاں دولت کی ریل پیل تھی لیکن صبح ہوئی تو دانہ دانہ کو محتاج ہو گئی یا اولاد ایسی ناخلف نکلی کہ توبہ نہ بن پڑی اور حرام راہ سے جو مال آیا تھا اس کا نہ صرف صفایا ہو گیا بلکہ اولاد مصیبتوں اور گناہوں کے دلدل میں پھنس کر دنیا میں بھی ذلیل ہوئی، آخرت میں بھی ان کے لیے ذلت مقدر ہوئی اور ماں باپ کے لئے بھی وہ وبال جان بن کر رہے۔ دنیا اور آخرت کا خسارہ اسے ہی کہتے ہیں۔

ڈنڈی مارنے کا عمل ایک ایسا بیج ہے کہ جب وہ برگ و بار لاتا ہے تو اس کے

## تطفیف کا عمل

ہر زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اس کی ہے چنانچہ فرمایا کہ ”ویل للمطففین“ (خرابی ہے تطفیف) کا عمل ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہے تو واقعتاً اس کا تعلق تو زندگی کے ہر گوشہ سے و حرام کی تمیز کے اٹھ جانے جیسے اعمال اس کی سان عبادات میں بھی ڈنڈی مارنے سے نہیں حضرت انسان کا شیوہ بن گیا ہے اور اس کے یادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ تطفیف انسانی ہونے کا احساس ہی اٹھ گیا ہے مثلاً اگر استاد طرح سے نہ پڑھائے تو یہ بھی ڈنڈی مارنے کا گوشہ ہائے حیات کا اندازہ کر لیجئے۔ اس کے سے آج خاندانی نظام درہم برہم اور اداروں کا مل یہ کہ پورے سماج کی کل کی کل ٹیڑھی ہو گئی نے دیجئے ہمارے ایک پرنسپل سید حفیظ الدین نجی ڈاک آفس اوقات میں پڑھنے کو جرم سمجھتے اور قلم رکھتے تھے۔

کی توفیق، اس کے حضور جواب دہی اور فرض

## مذہب کی مظلومیت ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

تاریخ انسانی میں مذہب، معاشرہ نیز انفرادی طور پر اس کے افراد کے اخلاق و کردار پر جو مثبت و خوشگوار اثرات مرتب کرتا رہا ہے اسی کی بدولت سماج ایک مہذب و متوازن سماج کہلائے جانے کا مستحق قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن یہ اس وقت ہی ممکن ہو سکا جب انسان نے مذہب کی عظمت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا اور وہ اس کی اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا ہوا۔ اس طرح وہ مذہب کا تابع بنا رہا لیکن فساد اس وقت شروع ہوا جب انسان نے اپنے ذاتی مفادات اور مقاصد کے لیے مذہب کو اپنا تابع بنانا چاہا اور اس کا استعمال و استحصال کرنے میں اسے دریغ نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مخالفت میں تحریکیں چلائی گئیں اور کہنے والے نے کہا کہ مذہبی منصب پر بعض دفعہ ایسے لوگ بھی فائز ہوئے، جن کے کرتوتوں سے ابلیس بھی شرمایا گیا۔ اور مذہب کی زمین اپنے نام نہاد مذہبی رہنماؤں کی بدولت ”برگ افیون“ وقتاً فوقتاً گلنتی رہی ہے اس سے ہر مذہب پسند کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

مذہب کو تابع بنانے کی شکلیں مختلف رہی ہیں مثلاً معاشرے میں مذہب کے وقار و عظمت اور اہمیت و افادیت اور اس کے تئیں عقیدت مندانہ جذبات کے پیش نظر تجارت کرنے والوں نے تجارت بھی کی، تو ہمارے کو پروان چڑھایا اور اندھی عقیدت کا فائدہ اٹھایا، مذہب کے نام پر سیاست کا بازار بھی گرم کیا جاتا رہا، اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لیے مذہب کا استعمال آڑ کی ٹٹی کے طور پر بھی ہوتا رہا انسان کی عیار عقل نے مذہب کو مظلوم بنا کر

ہیں، آخرت میں حقوق العباد کے کٹہرے میں  
کے تصور سے ہی روح کا نپ اٹھتی ہے ناپ  
س کو تباہی کرنے والوں اور امانت میں خیانت  
لوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ آخر انہیں ایک نہ  
لُٹک انہم مبعوثون۔ لیوم عظیم  
ان کو اٹھنا ہے اس بڑے دن کے واسطے۔  
باز آجائے تو زندگی کی گاڑی پڑی پر آجائے  
ئے۔

دل کی کھیتی کی فکر کرتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو یہاں بوئے گا وہی آخرت میں کاٹے گا آخرت رخی زندگی کی بدولت اسے آخرت میں بھی سرخرو ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ اور دنیا کی ذلتوں سے محفوظ رہنے کا بھی۔ لیکن خوف خدا اور خوف آخرت سے بے فکری کے نتیجہ میں تاریخ و قافلاً المیہ سے دوچار ہوتی رہی اور مذہبی رہنماؤں کی لغزشوں اور خطا کاریوں سے مذہب کو جس قدر نقصان پہنچا، اس قدر نقصان مذہب کے مخالفین سے بھی مذہب کو نہیں پہونچا۔

مذہب کی مظلومیت میں مذہبی رہنماؤں سے عقیدت میں غلو کا بھی ایک عنصر کارفرما ہے عقیدت تو مطلوب ہے لیکن اس میں غلو مذموم۔ سرکارِ دو جہاں ﷺ کا فرمان اگرچہ آپ ﷺ کی ذات گرامی سے متعلق ہے لیکن محسن انسانیت کی زبان حق ترجمان سے ایک رہنما اصول مذہبی رہنماؤں کے لئے وضع ہو گیا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ نصاریٰ نے جس طرح ابن مریم کو حد سے زیادہ بڑھایا اور غلو کیا تم میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں تو مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔

اندھی عقیدت، غلو اور خدا سے بے خوفی وہ عناصر ہیں جو مذہبی رہنماؤں کو دنیا و آخرت کے پاس دلچسپی سے تو بے خوف کر ہی دیتے ہیں البتہ مذہب کے تئیں عام انسانوں کے اعتبار و اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچا کر مذہب کو مظلوم بنا دیتے ہیں۔ اس دن سے ڈرنا چاہئے جب انسان کے اعمال پلٹ کر رکھ دیئے جائیں گے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجائے گا۔

والے مذہب سے عقیدت مندانہ جذبات کا استحصال کیا جاتا رہا اور اس طرح مذہب کے لڑنے میں تامل نہ ہوا۔

یہی لوگوں سے ہوسکا کہ بظاہر جن کی زبانیں نے مذہب اور اس کی اعلیٰ قدروں کی تصدیق و جلوت میں تضاد نمایاں رہا، افسوس کہ بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کی مثالیں ہمیشہ م کی عقیدت مجروح ہوتی رہی، اعتبار جاتا رہا ہوا۔ اس میں صرف کلیسا و شوالہ ہی کی مثالیں ہر علماء سوء بھی برابر پائے جاتے رہے ہیں۔

فعل کا یہ تضاد اور ظاہر و باطن کا یہ فرق اپنے پیدا ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ خدا کا خوف ہی مذہب، انسانی زندگی پر مثبت اثرات مرتب ایک لاشہ ہے جس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنے لگتا ہے۔

پیش نظر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دین فطرت سے رہنما اصول مقرر کئے ہیں اسلامی تعلیمات کی بنیاد قرار دیتے ہوئے مذہب کی مظلومیت کی (انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔) کہ ایسا عالم جو خوفِ الہی کا حامل ہوتا ہے وہ میں اللہ کی محبت اور خلوص کا بیج بوتا ہے، پھر آہ نیم شمی سے اسے پانی دیتا ہے اس طرح

مسلم دشمنی میں مسلمانوں کی شبیہ کو منسج کرنے کے لئے انہیں Fundamentaist کا نام دینا (Misnomer) دراصل تعبیر و اصطلاح کی غلط تشریح، اس کو غلط معنی پہنانے کے مترادف ہے نائک صاحب نے بجا طور پر کہا کہ جب تک ایک سائنسداں سائنس کے Fundamentals کو نہ جانے وہ ایک سائنس داں بننے کے مراحل پورے کر ہی نہیں سکتا بالکل یہی اصول ایک مسلمان کے سلسلہ پر بھی صادق آتا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے سچا مسلم بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی ارکان اور اس کی بنیادی تعلیمات پر صدق دل سے عمل پیرا ہو۔ علاوہ ازیں اسلام کی تعلیمات میں ایک بھی اصول ایسا نہیں ہے جو انسانیت کی نفی کرتا ہو اور جس سے انسانی قدروں پر کوئی ضرب پڑتی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے حقیقت کی سطح اور اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو سستی انسانیت کے درد کا درماں اسلام ہی ہے، اور دنیا آج بھی اسی کی محتاج ہے اس کی ایک مثال غربت اور بھکمری ہے جو انسانی دنیا کے لئے ایک بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہے اسلام نے زکوٰۃ کی شکل میں اس کا حل پیش کر دیا ہے اور موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اگر دنیا کے ۱۲۵ امیر ترین افراد اپنی دولت کا صرف ۲.۵ حصہ اس مقصد کے لئے وقف کر دیں تو دنیا غربت سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ اسی طرح تعزیرات پر اشکالات کئے جاتے ہیں اور اسلامی سزائوں پر واویلا مچایا جاتا ہے لیکن انسان کے بنائے ہوئے مروجہ قوانین کے باوجود جرم کو جرم سمجھنے کی ذہنیت اور قانون کے شکنجہ سے بچنے کے مزاج کی بدولت جرائم کے گراف میں اضافہ کا عالم یہ ہے کہ امریکہ و یورپین ممالک میں ۱۹۹۶ء کے ایک دن میں پیش آنے والے بدکاری کے واقعات کی تعداد ۲۷۳۰ درج کی گئی ہے۔

یہ چند ایک مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اسلام مسئلہ نہیں، بلکہ مسائل کا حل ہے اور کیوں نہ ہو کہ اس دنیا کے بنانے والے مالک کا صاف لفظوں میں اعلان ہے کہ (ان الدین عند اللہ الاسلام) اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مشنری مذاہب کی ہزار کوششوں کے باوجود اسلام کی حقانیت اپنا لوہا منوار ہی ہے اور نتیجہ میں حلقہ بگوشان اسلام کی شرح دوسروں سے

## مسائل کا حل

داعی ڈاکٹر ذاکر نائک نے لکھنؤ کے کرچین مسلمانوں کے لئے میڈیا کی وضع کردہ گمراہ کن نہیںوں نے کہا کہ یہ اصطلاح پروٹسٹنٹ تحریک کی تھی چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے قدیم تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے:- "A

person who strictly adheres to the tenets of a particular religious or political doctrine"۔

ہب کے قدیم (وبنیادی) اصول و عقائد پر بے فائدہ منظر کی تعریف میں کمال ہوشیاری کے ساتھ مخصوص کر دینے کی کوشش کی گئی اس کی تشریح ان الفاظ کے ساتھ درج ہے۔

"A fundamentalist is a person who adheres to the ancient doctrines of any religion or political system."

جانا ہی ظلم کہلاتا ہے پھر تعبیریں اور اصطلاحات کے دل و دماغ کو متاثر کرتی اور اس کے عمل و سیرات و اصطلاحات کی وضع کاری کوئی تہذیب کی ایک مذموم کوشش قرار دیا جائے گا۔

## شکایت نہیں، حل

ایک شمارہ کا مسودہ لے کر اشاعت کے لئے جب میں پریس پہنچا تو Negative پلیٹ بنانے والے ٹیکنیشن (Technician) نے کہا کہ اس مرتبہ آپ کے ٹائٹل کے اشتہارات اپنی مطلوبہ سائز سے کچھ بڑے ہیں۔ جواب میں میں نے کہا کہ آپ شکایت کرنے کے بجائے اس رخ پر سوچئے کہ مسئلہ کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ پاس ہی کھڑے ہوئے دوسرے ٹیکنیشن نے کہا کہ اس اشتہار کو مطلوبہ سائز پر لانے کے لئے Reduce کیا جاسکتا ہے چنانچہ اسے Reduce کیا گیا اور مسئلہ حل ہو گیا۔

آج کاغذ کے مواد (Matter) کو گھٹانے (Reduce) یا بڑھانے (Enlarge) کے اس عمل کا مشاہدہ ایک عام آدمی کو بھی زیر اس کی Photostate مشینوں پر آئے دن پیش آتا رہتا ہے Reduce کرنے یعنی گھٹانے اور Enlarge کرنے یعنی بڑھانے کے اس عمل کو دوسرے لفظوں میں Adjustment بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک دوسری مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ دوران سفر ریل یا بس کی سیٹ (Seat) پر آپ تشریف فرما ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک معمر شخص کھڑا ہوا ہے اگر آپ کچھ گنجائش نکال کر اس معمر شخص کو بھی اپنے پاس بیٹھنے کے لئے جگہ بنا دیں تو یہ عمل بھی Adjustment کہلائے گا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بے زبان زیر اس (Zerex) مشین بھی اپنے آپ میں ایک پیغام رکھتی ہے Enlarge اور Reduce کرنے کی اس میں پائی جانے والی صلاحیت کو دوسرے لفظوں میں پلک کی صلاحیت بھی کہا جاسکتا ہے۔ فطرت کی نشانیوں میں

## محض تمنا کافی نہیں

۲۱ ستمبر کو ندوہ کے مہمان خانہ میں الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ایک معروف شخصیت نے جناب ناظم ندوۃ العلماء سے ملاقات کی، مہمان کا تعلق اکثریتی طبقہ سے ہے، ”پیام انسانیت“ کے پلیٹ فارم سے کی جانے والی کوششوں کا تذکرہ آیا، بانی تحریک پیام انسانیت حضرت مولانا علی میاں کا ذکر خیر بھی ہوا اور اس تحریک کے پشت ان کی دردمندی و دلسوزی کی باتیں بھی ہوئیں، یہ حضرات محو گفتگو تھے اور راقم الحروف کو یہ واقعہ یاد آ رہا تھا جس کے راوی مولانا محبوب الرحمن صاحب از ہری ہیں کلکتہ کے ایک جلسہ میں حضرت مولانا علی میاں مہمان تھے اور از ہری صاحب میزبان ..... میزبان نے اپنے معزز مہمان کا تعارف کرایا جلسہ کے بعد از ہری صاحب سے مولانا نے کہا کہ آپ نہ جانے کس کس حیثیت اور عنوان سے میرا تعارف کر رہے تھے، لیکن میں اس دوران یہ سوچ رہا تھا کہ آپ بحیثیت انسان میرا تعارف کراتے ہیں یا نہیں ..... یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک ایک شخص کا انسان ہونا اس کا سب سے بڑا وصف اور اس میں انسانیت کا پایا جانا اس کی حقیقی پہچان تھی، غالباً یہی وہ فکر تھی کہ جس کی بدولت مولانا نے جب دیکھا کہ انسان اپنی اس بنیادی پہچان سے بیگانہ ہو رہا ہے اور نتیجہ میں اس کے اندر کا حیوان جاگ رہا ہے تو وہ بے چین ہو گئے اور اپنی تمام تر علمی و تصنیفی مصروفیات کے باوجود (جو کہ یکسوئی کی طالب ہوا کرتی ہیں) تحریکی نوعیت کی سرگرمیوں میں بھی مشغول ہوئے ..... آج الحمد للہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریک پیام انسانیت کی ضرورت نکھر کر سامنے آرہی ہے ..... تحریک پیام انسانیت کے لئے اس ملک کی سرزمین زر خیز ہے اس لئے کہ یہاں کا

ہے مثلاً تیز آنندھیوں میں بھی ایسے پودے اور احمیت ہوتی ہے جبکہ اس کے برخلاف ایسے جاتے اور اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں۔

یکھئے، تیز و تند ہواؤں کے جھونکے اس گھاس پر رز نہیں ڈال پاتے۔ نرم گھاس کی نرم روی اسے نرم گھاس کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ وہ ہوا کی تیزی سے نقصان دہ پہلو سے خود کو بچالے جانے کا گھاس کی نرم روی میں بھی بڑا سبق ہے۔

مثال نرم گھاس کی ہوئی جو تیز و تند ہواؤں سے کا پہلو رکھتی ہے جبکہ فطرت کی نشانیوں میں روں سے محفوظ رہنے کے لئے مستحکم و مضبوط کے پھیڑے اس کا کچھ بگاڑ نہیں پاتے۔

حال سے بتاتی ہیں کہ مسائل کے حل کے لئے کے درخت کی سی سختی و مضبوطی بھی۔ جس طرح چیزیں اس کا رخانہ عالم کے نظم کو چلانے کے بھی حسب ضرورت لچک و نرم روی اور استحکام۔ ایک ہی آسمان پر مگر الگ الگ اوقات میں روشنی پیش و تمنازت کی مظہر ہے اور چاند کی اس اصول کا تعلق زندگی کے عام رویہ می اور اس سے متعلق مسائل کی، تو اس کا اٹل مسلمانوں کا صدیوں سے چلا آ رہا موقف بھی کا ہے پابند“

جنون“ کے مقابلہ میں ”تعمیر سے عشق“ کا پہلو نسبتاً کمزور اور غیر منظم ضرور ہے۔

دوران گفتگو تیسری بات یہ سامنے آئی کہ ہندو مسلم قوموں کے مابین بہت سی بے بنیاد غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں..... واقعہ یہ ہے کہ ایسی ہی غلط فہمیوں کی بنیاد پر نفرت کی کاشت کرنے والوں کو غذا اور کھاد مہیا ہو رہی ہے البتہ اس کے ازالہ کے لئے کی جانے والی کوششیں اس کے مقابلہ میں کم اور کمزور معلوم ہوتی ہیں۔

حالات کا یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ ایک طرف ببول کی کاشت نہایت منظم و منصوبہ بند طریقہ سے کی جا رہی ہے جب کہ گلاب کی کاشت کی کوششیں نسبتاً سست اور کمزور ہیں۔ جبکہ یہ دنیا عمل کی دنیا ہے، یہاں محض تمنا کافی نہیں بلکہ عمل ضروری ہے۔ فہل من مدکر۔

ن گفتگو جناب ناظم ندوۃ العلماء نے اس کی ہے ہیں راستہ میں مغرب کی نماز ایک مسجد میں ہے اور مسجد کے کاموں میں اس کا تعاون بھی م سے ملاقات بھی کی..... تو یہ ہے ہمارا اصل..... باہمی محبت و رواداری کا مزاج!..... اس تہ فرق صرف یہ ہے کہ جو لوگ مٹھی بھر ہیں، وہ بچیدہ ہیں، جبکہ امن پسندوں کے پاس سنجیدہ لوگ مٹھی کی طرح متحد ہیں اور امن پسند لوگ

نے جناب ناظم ندوۃ العلماء سے ایک بات پاس پیغام..... ہمارے آپ کے مابین ایک نچے، اس کے لئے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے جیسے وسائل تو معصوم ہوتے ہیں البتہ ان کا چھری کی مثال لیجئے جو فی نفسہ بے ضرر ہے۔ ہے کہ وہ اس چھری سے سیب کاٹتا ہے یا کسی میڈیا کی ہے میڈیا فی نفسہ معصوم اور بے ضرر اس کو اپنے کام میں لانے کے لئے جس تیزی سے طرح مسموم بنادیا، افسوس کہ اس سطح کی میں آتی جو میڈیا کو مثبت اور تعمیری رخ دے گی اسی کمزوری اور کوتاہی کا احساس ہوتا ہے کی دنیا میں متعصب ذہن کی کار فرمائی اور اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہئے کہ ”تخریب کے

Portia کا کردار آج بھی زندہ ہے، اور ظلم کے خلاف مظلوم کی حمایت میں اٹھائی جانے والی اس کے ضمیر کی آواز کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے، اور اطمینان دلا رہی ہے کہ انسانیت کا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا۔

Shylock کے ظلم و جارحیت کے کردار (Role) اور Portia کی عدل و انصاف کی دہائی کے کردار کی مثالیں شکسپیئر کے مغربی معاشرہ میں آج بھی دیکھنے کو مل رہی ہیں لیکن Portia نے رحم کی اپنی اپیل میں ایک بڑا خوبصورت تخیل اور ایک حسین تمنائے بھی پیش کی تھی کہ..... قدرت رکھنے کے باوجود عفو و درگزر سے کام لینے کی ادا ایک ایسی ادا ہے جس میں ربانی صفت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ..... ”قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دینا“..... محض ایک تخیل اور تمنا ہے یا عمل کی دنیا میں اور عمل کی سطح پر ایسے واقعات رونما بھی ہوئے ہیں یا نہیں؟ اس کا واضح جواب ہمیں حیات رسولؐ میں ملتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر پوری قدرت رکھنے کے باوجود آپؐ کے عفو و درگزر کے معاملہ کو اس کی ایک نہایت روشن اور کمال درجہ کو پہنچی ہوئی مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ حضور پاکؐ کی ذات گرامی اسوہ اور نمونہ ہے، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے قریش سے پوچھا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک کروں گا تو قریش نے کہا تھا: آپ کریم ہیں اور کریم کی اولاد ہیں، اس لئے آپ سے خیر ہی خیر کی امید ہے..... اور حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا..... لا تثریب علیکم الیوم وانتم الطلقاء تم پر آج کوئی الزام نہیں، تم سب آزاد ہو۔

مظلوم کے حامی شکسپیئر نے Portia کی ربانی..... ”قدرت رکھنے کے باوجود عفو و درگزر سے کام لینے اور معاف کر دینے“..... کے جس حسین تخیل اور خوبصورت تمنا کے ذریعہ دلا سہ اور تسلی کا کام لیا تھا، اسلامی تاریخ کے صفحات پر اس حسین تخیل اور خوبصورت تمنا کو ”واقعہ“ اور ”حقیقت“ کے عملی روپ میں دیکھا جاسکتا ہے، لیکن افسوس کہ اسلام کے

کی سزا

Merchant of Venice اس کا ایک کی علامت بن گیا ہے کہ وہ اپنے مقروض بنانے کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیتا ہے، یہ مقدمہ ہے اس لئے کہ Shylock اس میں کرتا ہے۔ عدالت میں Antonio کی پیروی کے حق میں Shylock سے انسانی اس اپیل کو ظلم کے قالب میں ڈھال دیا ہے تے ہوئے کہتا ہے کہ مادی طاقت و قوت کے ہے تو یہ مادی طاقت و قوت ربانی صفت کا مظہر

ہے، مگر صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ آج اسے کے لئے اس کے مقروض ہونے اور اس پر مت نہیں ہے، بلکہ اس پر ظلم کرنے کے لئے وہ لیتا ہے۔

کے بعد بھی Shylock جیسے ظالم کے ساتھ مانی بنیادوں پر رحم کی اپیل کرنے والی خاتون



## دین کے نام پر دنگل نہ پیا کریں!

ائمہ اربعہ کی پاکیزہ و مقدس ہستیوں میں ایک نام حضرت امام مالک کا بھی ہے۔ ان کے فقہی مسلک پر عمل کرنے والے مالکی کہلاتے ہیں۔ ان کی کتاب مؤطا ہے۔ جو ان کے فقہی مسلک کی ترجمان ہے۔ امام مالکؒ کا زمانہ خلیفہ ہارون رشید کا زمانہ تھا خلیفہ ان کے تبحر علمی اور فقہی بصیرت کا قائل تھا۔

چنانچہ اس نے چاہا کہ مؤطا امام مالکؒ کو اپنی مملکت کا متحدہ قانون بنادے اور اس طرح مالکی مسلک کو سب کے لئے لازم قرار دے دے ظاہر ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک اپنا مسلک صحیح بھی تھا اور رائج بھی لیکن وہ ایک فقید المثل فقیہ تھے، حکمت ان کی سرشت میں شامل تھی چنانچہ امام مالکؒ نے خلیفہ ہارون رشید سے کہا کہ امیر المومنین! صحابہ گرام الگ الگ علاقوں میں گئے جس کے نتیجے میں ہر شہر کے پاس اپنی خاص احادیث و آثار اور فقہی مسالک ہیں اس لئے مناسب نہیں کہ میں اپنی رائے کو (جس کو میں برحق سمجھتا ہوں) سب پر مسلط کروں۔

امام مالکؒ کا یہ واقعہ مسلکی اختلافات کے سلسلہ میں نہ صرف ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ایسے حالات کہ جب جب بھی ملت میں مسلکی اختلافات کو ہوا دینے کی کوششیں کی جائیں، یہ واقعہ قطب نما کا کام دے گا اور بتائے گا کہ دین فطرت اسلام میں پائے جانے والے ”فقہی اختلافات“ اصل میں ”فطری اختلافات“ ہیں۔ اس لحاظ سے فقہی اختلافات کو مٹانے کی بات غیر حقیقت پسندانہ بھی ہے اور غیر دانشمندانہ بھی!!

افسوس کہ ادھر ایک عرصہ سے مسلمانوں کے دو مسلکی گروہ باہم متصادم ہیں،

کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں کہ وہ دنیا کے  
...آخر ایسا کیوں ہے؟ عالم اسلام کے پاس  
مل سے دو چار کیوں کر ہے؟..... یہ ایک ایسا  
سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

مظلوم Antonio کے جسم کے تازہ گوشت کا  
ف اور رحم کی دہائی دے رہی ہے..... کہیں یہ  
نہیں ہے!!

## مصیبت اور معصیت کا رشتہ

حادثاتِ ناگہانی اور آفاتِ سماوی وارضی کا تازیانہ قہر خداوندی کی یاد دلاتا رہتا ہے اور دنیا پر وقتاً فوقتاً قیامتیں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ سیلاب کی تباہ کاری، طوفان کی ہلاکت خیزی، زلزلہ یا آتش فشاں کے پھٹ پڑنے کی ہولناکی کے تصور سے ہی جی کانپ اٹھتا ہے۔ خدا بچائے اور دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ ان آفات و حوادث کی وجوہات کی قیاس آرائیاں ہوتی ہیں، ہلاک شدگان کے اعداد و شمار کا اندازہ لگایا جاتا ہے مصیبت زدگان کی راحت رسانی کی ہنگامی انداز میں فکر کی جاتی ہے، خیر خواہی و ہمدردی اور انسانی جذبہ بلاشبہ اس کا مقتضی ہے۔ کوئی تڑپے اور اس پر کسی کی آنکھ نہ چھلکے تو وہ آنکھ کیسی! اور اگر دل واقعی دل ہے تو اس کے ساز سے تو محبت و ہمدردی کا نغمہ ہی پھونٹنا چاہئے ورنہ وہ دل ہی کیسا! اور پھر جب بستیوں کے اجڑ جانے، دیکھتے دیکھتے لاکھوں انسانوں کے لقمہ اجل بن جانے اور بچ جانے والوں کے بے خانماں و برباد ہو جانے اور کھاتے پیتے خوشحال گھرانوں کے دانہ دانہ کو ترس جانے کی خبر کوئی انسان سنے تو کون سنگ دل ہوگا جو مومن نہ ہو جائے اور اس سے جو کچھ بن پڑے اس میں وہ ہاتھ نہ بٹائے!

یہ سب کچھ قابلِ قدر اور ان شاء اللہ باعثِ اجر، لیکن کاش کہ دھیان کسی کہنے والے کے اس قول کی طرف بھی جائے کہ ”میں مصیبت میں تو گرفتار ہوا لیکن معصیت سے محفوظ رہا۔“ مصیبت گوارا لیکن معصیت سے ہزار بار توبہ اور رب علیم وخبیر کی امان و پناہ!!

حادثاتِ ناگہانی اور آفاتِ سماوی پر چند ہفتے یا چند مہینے تو خوب غم و اندوہ کا اظہار

ب پر مسلط کرنے کو عین دین سمجھا جا رہا ہے، علم کی نہیں بلکہ جارحانہ اور شدت پسندانہ ہے! شذاتِ خود ایک مذموم کوشش ہے لیکن اس نے عالمی سطح پر اسلام کو ایک چیلنج سمجھ کر دنیا الکفر بنیادوں پر تیشہ چلایا جا رہا ہے۔

ت کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور اسے کوشش کو آخر کس عینک سے دیکھا جائے؟ ہے جس نام سے ہو، قابلِ مذمت ہے تعصب میں وثائقِ یہودیت (Protocols) میں میتوں کو ہوا دینے کے لئے بڑے سائنٹفک ارنڈے دینی جماعتوں میں داخل کر رہے ہیں اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

غیر یہود ہمارے مد مقابل متحد ہوں مگر فکر کی اتفاقی اور اختلافات کے سبب جن کی جڑیں میں نہیں ہے، ہر طرح محفوظ و مامون ہیں۔ ل بنادیا ہے جس کی بنیاد نسلی اور مذہبی بڑھتے بڑھانے میں مصروف ہیں اور لمحہ بہ لمحہ وہ

ف اٹھائی جاسکتی ہے تب بھی چار انگلیاں تو اب خود کریں اور دین کے نام پر دنگل پنا کرنا

فنڈ اور ریلیف ورک کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو خدا نخواستہ بیماری تو کینسر کی ہو اور اسے دوا، سردرد کی دی جا رہی ہو۔ علاج ”علامت“ کا کیا جا رہا ہو اور مرض کی بنیاد سے نظریں چرائی جا رہی ہوں۔

معصیت کا یہ مرض لاعلاج نہیں اس کا علاج خود رحیم و کریم آقا نے بتلادیا اور کتاب ہدایت میں فرمادیا کہ استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ (اور یہ کہ تم لوگ اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ پھر اسی کی طرف متوجہ ہو) (سورہ ہود-۳) اور صادق و امین رسول کریم ﷺ نے فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اتنا خوش ہوتا ہے جیسا کہ وہ سوار جس کی سواری مع کھانے پینے کے کسی چٹیل میدان میں کھو جائے اور وہ مایوس ہو کر ایک درخت کے نیچے سو جائے۔ جب آنکھ کھلے تو دیکھے کہ وہ سواری کھڑی ہے، پس وہ سوار لگام پکڑ کے خوشی کی شدت میں یوں کہنے لگے کہ اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں، اور یہ غلطی انتہائی مسرت میں اس سے صادر ہوئی۔ (مسلم)

تو بس توبہ کا دروازہ قیامت تک کے لئے کھلا ہے، وہ بڑا وسیع ہے جو سورج کے مغرب کی طرف سے نکلنے کے وقت تک کھلا رہے گا پھر سچائی اور اعتراف قصور اپنے اندر برکتیں لئے ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ مسئلہ مصیبت کا نہیں، معصیت کا ہے اور اس کا حل رجوع الی اللہ ہے۔ اور یہ فرمان الہی ہمہ وقت یاد رکھنے کا کہ ”خشگی اور تری میں لوگوں کی بد اعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا۔ اس لئے کہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھادے (بہت) ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں“۔ (الروم: ۳۰/آیت ۴۱)

(سونامی طوفان سے متاثر ہو کر لکھی گئی ایک تحریر)

۸۷

کی غفلت طاری ہو جاتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ کی تھی یا سورت (گجرات) کے پلیگ نے کیا ذرائع ابلاغ سے برابر یہ خبریں ملتی رہیں کہ پوپ دھار رہے ہیں۔ نوجوان اخلاقی انارکی ہے ہیں اور ستم بالائے ستم قانون ساز ایوانوں ہے ہیں جس کی گونج سے شاید ایوان بھی لرز نسواں کا فریب خواتین کی عفت و عصمت کو م و بربریت کی وہ داستانیں رقم ہو رہی ہیں جو مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے۔ نفاق کا بن و مذہب کا استحصال کرنے میں بھی خدا سے بڑی برائی یہ ہے کہ برائی کو برائی سمجھنے کی فی البر والبحر“ کا عالم ہے اور بقول

معصیوں اور یہ طوفان ہزار سمندری طوفانوں ک اور تباہ کن ہے جوان حوادث و آفات اور با محاور دلوں سے ایسا فراموش کرا دیتا ہے گویا ہائے رے نادانی اور عاقبت نا اندیشی کہ اس کی توفیق کم ہی نصیب ہوتی ہے کہ وہ ”زخم تو“ ”معصیت“ کی تھی اور ہے۔

لو سمجھنے کی ضرورت ہے ستر ماؤں سے زیادہ کر؟ یا للجب نادان انسان کا دھیان اگر اس ندر روزہ آہ و ماتم، ہمدردی و خیر خواہی، راحت

لیکن ادھر انسانی دنیا کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوا کہ قدریں زوال پذیر ہوتی چلی گئیں اور علی العموم صاحبان اقتدار و قوت میں بھی۔ الا ماشاء اللہ۔ اخلاق و کردار کا زوال اس قدر نمایاں طریقہ سے رونما ہوا کہ اس میدان میں بھی وہی پیشوائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس بات کی تائید ایک کتاب Stupid White Men سے بھی ہوتی ہے، اس کا ایک باب ہے: ”ڈیئر جارج“ جارج ڈبلیو بش کے نام یہ ایک کھلا خط ہے جو ان کے قریبی ساتھی Michael Moore نے لکھا ہے۔ 18 صفحات پر مشتمل اس کھلے خط میں ایک طرف تو مصنف نے جارج بش کے ان اقدامات کی تفصیل گنائی ہے جو مفاد عامہ کے خلاف جاتے ہیں۔ دوسری طرف مصنف نے صدر موصوف کی تعلیمی لیاقت و صلاحیت پر سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔ مزید برآں ان کے جرائم گنا کر جارج ڈبلیو بش سے صدر بش تک کے ان کے سفر کی وہ روداد بھی سنائی ہے کہ کس طرح استحصال کے ذریعہ اور کتنے اشخاص کی حق تلفی کر کے اور ان کے جائز اربانوں کا قتل کر کے ان کے ملبہ پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنا قد بلند کیا ہے۔۔۔ ”ذاتیات“ کے عنوان سے ان باتوں سے صرف نظر کی گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے اور ہم بھی اسی کے قائل ہیں دروغ برگردن راوی لیکن یہ تفصیلات اس شخص کی ہیں جو روئے زمین پر آج دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور شخص باور کیا جا رہا ہے، اور جس کی زبان پر ”امن عالم، تعمیر نو، دہشت گردی سے پاک دنیا“ جیسے الفاظ اور نعرے ہیں جن کی قلعی بھی ایک ایک کر کے اب کھلتی چلی جا رہی ہے، اور جس سے مذکورہ بالا باتوں کو تقویت ملتی دکھائی دیتی ہے۔

امن عالم، دہشت گردی سے پاک دنیا اور تعمیر نو کے جھوٹے کھوکھلے نعروں کی ان کی فریب کاریوں سے نتیجہ میں سامنے آنے والی ایک دل خراش داستان تو وہ ہے جو بے گناہوں کے خون سے دل و دماغ پر نقش ہوتی جا رہی ہے، اور دوسری طرف Michael Moore جیسے انصاف پسند بھی تاریکی اور فریب کاری کے ماحول میں روشنی اور سچائی کی لکیریں کھینچ تو رہے ہیں!! دنیا کو درپیش معرکہ روح و بدن میں جہاں نگاہوں کو مومن کی فراست کی تلاش ہے وہیں سچائی اور روشنی کی یہ ریکھائیں ایک ایسے مستقبل کا پتہ دے رہی ہیں جو زبان حال سے گواہی دے گا کہ ظلم کی ٹہنی بھی پھلتی نہیں!!!

## پھلتی نہیں

ب سے چلتا ہے، مشہور ہے الناس علی اور اثر محض حکومت کے ایوانوں تک محدود نہیں اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں اپنے اپنے دور کے حکمرانوں کے ذوق و مذاق کا تک محدود نہیں، نامور و معروف شخصیتوں کے تے ہیں، اور ان کے ذاتی اوصاف، اور اسی نے یا ماننے والوں کی نگاہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ذاتیات نہیں رہتیں بلکہ سماجیات بن جاتی ہیں۔ بیات بنا دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ مغربی مبالغہ دے کر انسان کو بہت ساری اخلاقی

گیوں میں اخلاقی قدروں کی تلاش کو بے جا تدبیر کی زندگیاں اس پہلو سے بھی روشن اور اس کی دس بیس نہیں، ان گنت نظیریں ہیں۔ ب اقتدار تھے اور جن کا سکہ چلتا تھا!!۔ انسانی رہا کہ جن تخت نشینوں کی پر چھائیاں عوام

”امن و سلامتی کی دنیا“ بن جانے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا!

لیکن مسلمانوں کے احساس کمتری اور اغیار کے تعصب کا ستم دیکھئے کہ ان باتوں نے اسلام کو کٹھرے میں لاکھڑا کیا ہے ایک مثال مسلمان عورتوں ہی کی لیجئے ان کی مظلومیت کو اس وقت ایک موضوع بنادیا گیا ہے اور ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے کہ یہ ثابت کر دکھایا جائے کہ اسلام میں عورت مظلوم ہے۔

ہم تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے سر دست عورتوں ہی سے متعلق صرف دو مسائل طلاق اور وراثت میں ان کے حق کے ہی مسئلوں پر ذرا حقیقت پسندانہ انداز سے غور کر لیجئے۔ یہ دونوں مسئلے ایسے ہیں جو قانون فطرت سے میل کھانے والے اور مبنی بر انصاف ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ اسلام حلال امور میں سب سے ناپسندیدہ امر طلاق کو قرار دیتا ہے لیکن زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی دھوپ چھاؤں سے واقف کار حضرات اس تلخ حقیقت کو جانتے ہیں کہ کبھی کبھی زوجین کے مابین تلخی اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے کہ علیحدگی ہی میں ان کے لئے عافیت و سلامتی ہوتی ہے بصورت دیگر وہ ناخوشگوار واقعات اور سانحات پیش آتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ افسوس کہ خصوصیت کے ساتھ ہمسایہ قوموں میں اس کی نظیریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے چنانچہ دوسرے مذاہب کے لئے بھی طلاق کے طریقہ کو اپنائے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہا اور انہیں اس کے لئے قانون وضع کرنے پڑے۔ دوسرا مسئلہ عورتوں کے حق وراثت کا ہے اگرچہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کے ہاں بھی بڑی بے اعتدالیاں موجود ہیں لیکن اسلام ایک علیحدہ چیز ہے اور مسلمان بالکل دوسری چیز۔ دنیا کو اپنی اس غلطی یا غلط فہمی کو سمجھنا چاہئے کہ مسلمان کے کسی عمل کو اسلام کا قانون نہیں قرار دیا جاسکتا، اس عمل سے قطع نظر اسلام وراثت میں عورتوں کا حق دیتا ہے جو عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور حقوق نسواں میں سے ایک ایسا فطری و ضروری اصول ہے کہ ہماری ہمسایہ قوموں نے بھی وراثت میں عورتوں کے حصہ کے حق کو اپنے ہاں بھی رائج کیا تاکہ دنیا میں ایک متوازن مبنی بر انصاف نظام قائم ہو اور حقوق نسواں کی حق تلفی نہ ہو۔

س کا شعار

، عطا و بخشش ہے

ے میں غور و خوض کرنے کی جن کو توفیق ملتی  
غنیمت سمجھتے ہیں۔ صدق دلی سے امت کی  
مول صادق و امین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس  
بہتر ہے“ کی روشنی میں ملت اپنے مسائل پر  
نین کی دولت اس کے ہاتھ آجائے برخلاف  
حقوق کی بازیابی کے لئے جھوٹے آقاؤں کی  
ہے۔

بات کا یقین کہ مسلمان جس دین کے حامل  
کا دین ہے اور اس کے قوانین اسی کے وضع  
کا کہ اس نے ان کے اس یقین کی بنیادوں کو  
ٹی نے انہیں غفلت کی ایسی نیند سلا دیا ہے کہ  
نہیں کہ ان کے دامن میں کیسی کیسی نعمتیں اور  
سے نہ صرف ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں  
بھی وہ تدابیر ہیں جن کو اختیار کئے بغیر دنیا کا

## دستک

### ملت کے اقبال کا ماتم کب تک؟

اسرائیل کی بربریت پر اقوام متحدہ کی خاموشی یا زبانی جمع خرچ تو سمجھ میں آتا ہے اس لئے کہ UNO کا بڑا خرچ امریکہ برداشت کرتا ہے۔ UNO کی حیثیت زرخیز غلام کی ہے لیکن فلسطین و لبنان کے مسئلوں پر عربوں کی خاموشی مجرمانہ ہے اور ان کے بے بس ہونے ہی کی نہیں، ان کے بے حس ہونے کی بھی دلیل پیش کرتی ہے امریکہ نے سامراجیت کے لئے ان دنوں ایک آسان نسخہ ایجاد کر لیا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کی طرح اسے نہ تو ان ممالک کے مسائل کی دردسری لینی ہے نہ اپنے حکام و افسران مقرر کرنے ہیں بس کرنا صرف یہ ہے کہ دوسرے ممالک کے بازار میں اپنا پیر جما لینا ہے وہاں کے Resources پر قبضہ کر لینا ہے، ان کی آمدنی کو اپنی آمدنی بنالینا ہے، عرب ملکوں کے ساتھ یہی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ تیل کے ذخائر کے وہ بظاہر مالک دکھائی دیتے ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ بالائی کون کھارہا ہے اور عرب ممالک کے سربراہان ذہنی افلاس کا شکار دکھائی دیتے ہیں ورنہ اسرائیل نے فلسطین و لبنان کے معصوموں، بے گناہ شہریوں، بچوں اور مریضوں کسی کے ساتھ بھی ہمدردی کی ایک رنق تک نہیں دکھائی۔

بات صاف ہے کہ محض اسرائیل جیسے ایک چھوٹے سے ملک کے لئے اتنی دریدہ ذہنی اور وحشیانہ کارروائی ممکن ہی نہیں تھی اگر امریکہ اس کی کھلی پشت پناہی نہ کرتا۔ روس کے بکھر جانے کے بعد امریکہ کے واحد سپر پاور بن جانے کے بڑے سنگین نتائج دنیا کو دیکھنے پڑ رہے ہیں حاشا وکلا ہم روس کو نہ اچھا کہنا چاہتے ہیں نہ برا البتہ روس کے بکھر جانے سے دنیا

ب اس قدر کارفرما ہے کہ اسلامی اصولوں اور کرتے ہیں اور وقت آنے پر جی بھر کر انہیں ہے کہ اپنے ہاں اصلاح کے ایسے عمل کے اصل فسوس کہ نعمت اسلام سے وسروں کی ناواقفیت شعور و ادراک نہیں رکھتے بلکہ اس کے برعکس

سرخ ہوتی جا رہی ہے اور ان کی بے دینی سے سلام کل بھی تروتازہ تھا، اور آج بھی شاداب وجود کو منوار ہی تھی اور اس کی شادابی آج بھی بھی فراہم کرتا رہے گا۔

کے عین مطابق ہونے کی بنا پر دنیا اور دنیوی ہے ہیں اس حقیقت کو جس دن مسلمان ذہن حصار سے باہر نکل آئے گا اور اس وقت اس تھ یقین کہ وہ دولت ہوگی جس سے زنجیریں

ٹیررسٹ (Terrorist) پوری دنیا میں ایسی فضا اور ایسا ذہن بنا دیا گیا ہے کہ شک کی سوئی مسلمانوں کی طرف گھومنے لگتی ہے ہر مسئلہ اور کارروائی کو بلا تحقیق ان کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے دہشت گرد اگر مسلمان ہیں تو 6 دسمبر 1992 کو بامری مسجد کی شہادت میں کس کی دہشت گردی کام کر رہی تھی اب تو یہ خبریں بھی آنے لگی ہیں کہ مسلمانوں کی معروف وضع قطع کے ساتھ دہشت گردانہ کارروائیاں اغیار کرتے ہیں۔ وطن دوستوں بلکہ انسانیت دوستوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس حقیقت بلکہ حقائق کو بے نقاب کریں اور اصل مجرمین کو سامنے لائیں۔

جب بات دہشت گردی کی آتی ہے یا کسی عالمی سازش اور ریشہ دوانی کی آتی ہے تو ہمیں اس بدی کے محور صیہونیت کو نہیں بھولنا چاہئے، اس کے نیٹ ورک اور اس کے ناپاک عزائم کو نہیں بھولنا چاہئے بغیر تحقیق کے دہشت گردانہ کارروائیوں کا رشتہ مسلمانوں سے جوڑ دینا اور ساتھ ہی انکوائری کمیشن بٹھانے کی بھی بات کرنا عجیب منطق ہے اگر آپ ملزم کو نہیں بلکہ مجرم کی نشان دہی کر رہے ہیں تو پھر انکوائری کمیشن پر جہت کے لاکھوں روپے صرف کرنے کے کیا معنی؟ پھر انکوائری کمیشن کی طولانی کہ عوام کے ذہنوں سے بات چو بھی ہو جائے اور مجرم سامنے بھی نہ آئے علاوہ ازیں اس میں قیاس کو کتنا دخل ہوتا ہے اور سائنٹفک طریقہ کار کو کتنا اپنایا جاتا ہے اس پر بھی دیانتداری کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

بش کے نام نہاد امن کے نام پر دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے مسئلہ یہ ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے لیکن تاریخ امن کی مثال سے بھی خالی نہیں کہ ایک چھھر ایک متکبر بادشاہ کا خاتمہ کر سکتا ہے، ہر کمال اپنے زوال کو پہنچتا ضرور ہے اور تکبر کو ایک نہ ایک دن منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ یہ سب صحیح لیکن ان حالات میں ”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو“۔ ”ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی“۔ ”مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“۔ مسلمانوں کی مثال جسم واحد کی طرح ہے جیسے حقائق کو مسلمانوں نے پس پشت کیوں ڈال دیا موج خون مسلمانوں کے سر سے، پیغمبر صرح ﷺ کے ماننے والوں کے سر سے ہمیشہ گزرتی رہی ہے لیکن آج اور گزشتہ کل کا فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ہمارے

مریکہ کے سلسلہ میں بھی ہمیں ایک فرق کو ملحوظ پہلے اور بش کے بعد۔ بات ذہنیت کی ہے اتنی ہے یہی وجہ ہے کہ بش کسی بھی ملک کی خود

ہے جبکہ دنیا سے امن کا جنازہ نکالنے کے نت حاصل ہے طالبان اور اسامہ بن لادن کس پیداوار ہیں لیکن آج انہیں دہشت گردی کے وثبوت تو کیا کسی قیاس کی بھی ضرورت پیش نہ یا اس کو ہوا بنا کر پیش کرنے میں ہی بش کی یا جائے گا۔ عراق پر حملے کے جو جواز امریکہ کے بعد اس نے اقبال جرم کر لیا کہ ہماری بوں کے عوض پورے ملک کو ہلاک و برباد MIGHT IS جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی ہے۔

مثلاً ہیومن رائٹس واچ یا ایمنسٹی انٹرنیشنل تو ان لئے زبان و حوصلہ تو ہے لیکن ظاہر ہے کہ ملٹری نے کے لئے وہ کہاں سے وسائل لائیں۔ لیکن اب کی طرح انہوں نے اپنے مفاد اپنی عارضی نہیں ڈال رکھے ہیں عرب ممالک کی سیاست ملکہ ہے، شیعہ سنی انتشار کا مسئلہ ہے۔

مل ہوتی رہی ہیں یا یوں کہتے کہ وضع کی جاتی (Fu) ایکسٹریمٹ (Extremist) اور اب

## مسائل کے تجزیہ میں انسانی زوایہ نگاہ کو اپنانے کی ضرورت

یورپ اور دنیا کے بیشتر علاقوں میں جنگ کے خلاف زبردست مظاہروں اور اعلیٰ سطح کی امن پسندانہ کوششوں کو محض نظر انداز نہیں بلکہ یکسر مسترد کرتے ہوئے بالآخر جنگ کو مسلط کر ہی دیا گیا..... اور اس ہٹ دھرمی اور جارحیت پر دنیا حیران بلکہ ہراساں و پریشان ہے کہ نام نہاد دنیا میں ہماری آنکھیں آج بھی اسی جارحانہ اصول کی بالادستی اور کارفرمائی دیکھنے کے لئے مجبور و بے بس ہیں، جسے ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ اور MIGHT IS RIGHT کہا جاتا ہے!!!

جنگ کی تباہیوں اور ہولناکیوں کے تصور سے ہی روح کانپتی ہے..... دنیا کے کونے کونے میں جنگ کے خلاف ہونے والے مظاہرے جارحیت اور ہٹ دھرمی کے مزاج پر اثر انداز نہیں ہو سکے، لیکن وہ یہ تاثر ضرور قائم کر گئے کہ انسانی ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا، ایک دنیا جنگ کے مسئلہ کو دو ملکوں کا نہیں بلکہ عالم انسانیت کا مسئلہ سمجھتی ہے اور اس مسئلہ کو مذہبی یا تہذیبی زوایہ نگاہ سے نہیں بلکہ انسانی زوایہ نگاہ سے دیکھتی ہے بس یہ طرز عمل اور طرز فکر مایوسیوں کی ظلمتوں میں امید کی کرن ہے کہ انسانیت زندہ تو ہے! انسانی ضمیر زندہ تو ہے..... ایک رقص تو ہے، ایک وجد تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی!

مسلط کردہ جنگ سے قطع نظر عموماً سیاسی و سماجی مسائل پر بھی غور و فکر اور ان کا تجزیہ کرتے وقت انسانی و اخلاقی بنیادوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کے مزاج کو تقویت ملنی چاہئے اور

پالیس سے زائد بہاریں صرف اقبال و عروج کی تحریریں پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اپنی نگاہ ظاہر ہے کہ اگر ظلم کرنا گناہ ہے تو مظلوم ہے لیکن افسوس کہ ہم پر یہ کیفیت کچھ اس درجہ سن و طمانیت کا لطف آنے لگا ہے۔ قوموں کی ہے کہ یہ اس کے زوال و ادبار کی آخری نشانی ہے انسان کی قوت عمل کو فنا کر دیتی ہے سچیز کا نام ہے اقبال تو کہہ ہی گئے ہیں کہ یہ زندگی عمل سے بنتی ہے ضرورت تدبیر اور منصوبہ ہے، اس کی تعلیمات کی روشنی میں ہمیں تدابیر عمل کرنے میں ہے البتہ تدبیر اپنا اثر دکھانے لگے گی۔

ہیں نہ ان کے پاس وسائل کی کمی ہے اور نہ احتساب کی ہے کہ آخر پانی مر کہاں رہا ہے، میں ہم انحطاط پذیر ہوتے جا رہے ہیں جب ہے بیدار مغز دنیا پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں مسلمانوں کو بھی تو اللہ نے فراست عطا کی ہے موز کر بتایا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے ملی لگ جائیں۔



## احساس زیاں کافی نہیں احساس عمل بھی ضروری ہے!

سونا جب تپ کر بھٹی سے گزرتا ہے تو کندن بن جاتا ہے۔ عمل کی یہ دنیا بھی ایک بھٹی کی مانند ہے۔ جب انسان اس بھٹی سے گزرتا ہے تو اس کا علم محض علم نہیں رہ جاتا بلکہ ایک واقعہ اور تجربہ بن جاتا ہے اور اس کی واقفیت، 'حقیقت' کا روپ دھار لیتی ہے۔ تجربات کی اس بھٹی سے فرد بھی گزرتا ہے اور کبھی پوری قوم و ملت کو بھی اس سے گزرنا پڑتا ہے، تاریخ جہاں یہ بتاتی ہے کہ قوموں پر ایسے دشوار گزار مراحل آتے رہے ہیں، وہیں تاریخ یہ بھی سناتی ہے کہ قوموں کی مردنی زندگی سے اسی وقت تبدیل ہوئی جب وہ کسی بڑی مشکل اور شدید خطرے سے دوچار ہوئی۔ تاتاریوں کے سیلاب بلاخیز سے کون واقف نہیں جس نے مسلمانوں کے خون سے زمین کو لالہ زار بنا دیا تھا، یا آٹھویں صدی عیسوی کے اس سانحہ سے کون بے خبر ہے کہ جب صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ جمالیا تھا لیکن واقعات کی دنیا میں اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہو کر رہا کہ ہر تاریکی کے بعد سویرا ہے۔ چنانچہ تاتاریوں کے مقابلہ میں رکن الدین بھیرس اور صلیبیوں کے مقابلہ میں نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی ایسے ہی سویرے کی چمکتی دمکتی علامتیں ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اگر وہ ظلمتیں نہ ہوتیں تو شاید طلوع صبح کی یہ روشن علامتیں بھی ظاہر نہ ہوتیں!!

گویا ملت کے سر سے طوفان گزرتے رہے ہیں جنہوں نے نہ صرف سوتوں کو جگایا ہے بلکہ انہیں ایک جیتا جاگتا انسان اور سچا مسلمان بھی بنایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ طوفانوں کا رخ پھیرنا اسی وقت ممکن ہو سکا جب ملت نے اپنے باشعور

نیت اور فکر کو فروغ دیا جانا چاہئے تاکہ ایسی یاد ہوں جو دنیا کو مذہب و تہذیب کے خانوں چاہتی ہیں۔ ملکی و عالمی سطح پر آئے دن اس قسم کے عدل کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں، ایسے مظلوم کو دیکھنا چاہئے تاکہ ظالم کی مخالفت اور ہو سکے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب نے کا فیصلہ کرے۔

بہ میں حلف الفضول کے واقعہ میں اس کی ف معاہدہ میں آپؐ نے شرکت فرمائی تھی اور کے بعد بھی اگر مجھے از سر نو اس کی دعوت دی میرت پاک کا یہ باب بتاتا ہے کہ وہ دل، دل، زندگی کہلائے جانے کی مستحق نہیں جس کی

## صرف فکر مندی کافی نہیں

منصوبہ بندی بھی ضروری ہے

یہ دنیا دار العمل ہے عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی، مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی، غرض کہ دنیا میں شر اور خیر دونوں کا رفرما رہے ہیں اور رہیں گے۔ شر و خیر کے مابین تصادم کا سلسلہ چلتا رہا ہے کبھی شر غالب آتا ہے اور کبھی خیر۔ لیکن آج کی دنیا کے حالات پر غور کرنے والا غور کرے تو وہ بجا طور پر اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ خشکی و تری میں فساد پھیل گیا ہے اور یہ حضرت انسان ہی کے ہاتھوں کی کمائی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ شر کا یہ غلبہ آخر کس پہلو کی نشاندہی کر رہا ہے، کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ غلبہ شر کے خیمہ کے کارندوں کی اپنے مجنونانہ عزائم کی تکمیل کے تئیں محنت و لگن اور مستقل مزاجی کا پتہ دے رہا ہے جبکہ روئے زمین خیر کے علمبرداروں سے خالی بھی نہیں، ان میں خیر کے غلبہ کی خاطر جذبہ و حوصلہ بھی پایا جاتا ہے لیکن آخر وہ کون سی کمی و کوتاہی ہے جو ان کے وجود کو یا تو غیر مؤثر بنا رہی ہے یا کم از کم اُس درجہ اور سطح کے نتائج مرتب نہیں ہو رہے ہیں جن کی ان کی ذات اور صلاحیت و قابلیت سے توقع کی جاسکتی ہے، خیر کے علمبرداروں اور انسانیت دوستوں میں علماء بھی ہیں، دانشور بھی، اصحاب قلم بھی ہیں اور ارباب فکر و نظر بھی، مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ سب بکھرے ہوئے تاروں کی مانند ہیں جو جب چمکتے ہیں تو روشنی کا پتہ تو ضرور دیتے ہیں لیکن ان کی روشنی کے مجتمع نہ ہونے کی وجہ سے رات کی سیاہی ان پر غالب آ جاتی ہے، دنیا میں رونما ہونے والے منصوبہ بند واقعات اور حادثات سے اس بات

کے حوصلے اور ولولے پست نہیں کر دئے بلکہ ذہنی بنیادی چیز ہے، احساس زیاں کے ساتھ ہے تو وہ قوم ایک نئی زندگی سے روشناس ہوتی ہے اور حکمت و تدبیر سے کام لینے کا اس کا ذہن اس میں وہ چٹنگی اور بالغ نظری پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن احساس زیاں کے ساتھ احساس عمل ہاں تک کہ تاریکی پر روشنی غالب آ جاتی ہے اس ہوتی ہے تو پھر آنکھ کا آنسو، آنسو نہیں رہتا ہانے کا نہیں بلکہ بہتے ہوئے آنسوؤں کو موتی کا وقت ہے۔

اس قوم کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ علاج کی فکر کرتی ہے اور صحیح رخ پر محنت کرنے باہم متحد رہنے کا ہنر سیکھ لیتی ہے، پھر اس کا جی چہ جلد برآمد ہوتے دکھائی نہیں دیتے لیکن جو س، پھر وہ قوم اپنے اندر ”اپنا احتساب آپ“ کے اصول کو اپنانے کا جذبہ بھی اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ شعور کا بیدار ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ساری کھیتی فصل کی تمنا کی جاسکے۔ دوسرے لفظوں میں رجحان مسلسل کا نام ہے جو یہ مژدہ سنا تا ہے کہ رہو گے اگر تم مومن ہو۔“

برسوں پہلے ایک مردِ دانا نے دنیا کو ایک ایسے ہی پروگرام سے روشناس کرایا تھا اور ”تحریکِ پیامِ انسانیت“ کے نام سے ایک چراغ روشن کیا تھا، آج جب کہ ہوائیں شدید اور تیز و تند ہو گئی ہیں، اس چراغ کی لو کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ہے کوئی جو وقت کی اس پکار پر کان دھرے اور انسانیت دوستوں کو بروقت ایک صحیح سمتِ سفر، لائحہ عمل اور پلیٹ فارم عطا کر دے!

۱۰۳  
علمبرداروں میں جو کمی اور کوتاہی ہے، وہ ہے کافی نہیں ہوا کرتی، فکرِ مندی کے ساتھ منصوبہ

لو یہ ہے کہ عوام نے اتنے دھوکے کھائے اور اس اور خیر کے نمائندوں کو پہچاننے اور ان میں پہنچنے یہ تناسب کم ہی سہی، لیکن زخمِ خوردہ عوام کا م کے شعور کی بیداری بڑے انقلاب کا پیش کا کوئی دستہ اٹھے، مضبوط و مستحکم اور مشترکہ مثبت و تعمیری پروگرام لے کر آگے آئے اور ان افسوس کہ عوام اپنے شعور کے جاگ جانے سانیت کے علمبردار، تاروں کے مانند بکھرے ہیں کہ سیاہ بادلوں کے مانند اٹھنے چلے

۱۰۴  
ول تو یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ شر کے کارندوں کی بھی ہوتے ہیں جو کسی غلط فہمی اور پروپیگنڈہ پچہ جب غلط فہمیوں کے ازالہ کی سنجیدہ کوششیں ہیں۔

۱۰۵  
ہے کہ انسانیت کا دم بھرنے والے بلا تفریق مانیت کو بچانے اور اس کے پیغام کو درر تک ج دیں۔ دنیا میں کانٹے بکھیرنے والے کانٹے بچھانے کا اگر کوئی منصوبہ بند پروگرام نہ ہو تو ہی کانٹے ہو جائیں گے۔

کی تربیت کا کام کرنے والوں پر جلد ہی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی پرچھائیاں پڑنے لگیں، نتیجہ میں بنیاد کا وہ پتھر نصب نہ ہو سکا جس کے بل بوتے پر ایک مستحکم عمارت کی توقع کی جاسکتی تھی اور عوام کا وہ ذہن بن نہ سکا جس کے ذریعہ ایک صالح اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا تھا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ اجتماعی شعور کے بیدار ہونے کی وجہ سے جنرل ضیاء الحق مرحوم جیسی دین پسند قیادت کو بھی مختلف محاذ پر ناامیدی سے دوچار ہونا پڑا۔ بات صرف پاکستان کی ہی نہیں بلکہ کسی بھی مشن کی کامیابی کا دار و مدار شعور کی بیداری پر موقوف ہے، ذہن سازی کا یہ کام چمن بندی کی طرح صبر آزمائے کام ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر پتہ ماری، جگر کاوی اور حوصلہ مندی کا طالب ہے اور اسی کے بس کا ہے جو سچے کونلہ کی مانند سلگنے کا ہنر جانتا ہو، اسکے نتائج دیر پا ضرور ہیں مگر ہیں پائیدار اور مستحکم، اسلئے کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ دینی شعور کی بیداری کے کام کے لئے ایسے مخلص، باصلاحیت اور صاحب کردار مردان کار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس بنیادی کام کو اپنا مقصد حیات بنائیں اور انکی کوششیں ملت کی تعمیر نو کے لیے بنیادی پتھر کا کام دیں، تاج محل کے بنیادی پتھر جو اگرچہ خود نظر نہیں آتے مگر اس عمارت کے حسن کی جلوہ گری انھیں کی مرہون منت ہے، پاکستان میں یہ کام اگر لگن اور کڑھن کے ساتھ مسلسل جاری رہتا اور چند جماعتیں بنیاد کا پتھر بن جانے پر رضامند ہو جاتیں اور دینی شعور کی بیداری کی خاطر اپنی تمام تر توانائیوں کو وقف کر دیتیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے ملک میں آج اسلام کے لیے زمین کے ہموار نہ ہونے کا مسئلہ باقی رہتا۔ دینی شعور کی بیداری کا کام منصوبہ بندی چاہتا ہے، وہ قوم جو خود کوئی منصوبہ نہیں رکھتی اس کے لئے مقدر ہے کہ وہ غیروں کے منصوبوں کا شکار ہو کر رہ جائے۔

کی بیداری

کا کام یہی ہے!

پاکستان میں انتخابات ہو رہے ہیں۔ کسے نہیں سن اس حقیقت سے بھی کون واقف نہیں کہ اس ملک میں رہا، بازی گر آسمان سیاست پر نمودار ہوتے ہیں کچھ، کا تجربہ و مشاہدہ کرتی رہی۔ اس ملک اور دنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں کہ کون بازی ہے گا، کوئی فتح سے ہمکنار ہوگا اور کوئی شکست کھائے گا اور اسکے نتائج سے بھلا کسے انکار۔ تجربہ سے گئے مگر ہمیں تو پاکستان کے تجربہ کی روشنی میں کے نام پر مملکت پاکستان کا مطالبہ کرنے میں کامیابی تو مل گئی لیکن افسوس کہ پاکستان کی نہیں کیا جاسکا، اول الذکر واقعہ دنیا کے نقشہ دنیا میں انقلاب بپا کر دینے کا کام۔ پہلی بات اور دوسری بات وقوع پذیر ہونے کے لئے مت کر جانے کی ضرورت تھی۔ اس سے انکار نہیں کا کام ضرور ہوا مگر افسوس کہ فکر کی تعمیر اور شعور

تاریخ کے صفحات میں اس دعوت کی ایک ہلکی سی جھلک اس میدان جنگ میں دیکھنے کو ملتی ہے جب جاں بلب صحابہ کرام کے پاس پانی پلانے والا پہنچتا ہے تو ایک صحابی دوسرے صحابی کی طرف پانی لیکر بڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں اور اسی طرح دوسرے صحابی تیسرے کی طرف..... آخری سانس تک بھی ایک دوسرے کی ہمدردی اور ایک دوسرے کے لئے ایثار کی ایسی مثال پیش کرنے سے دنیا کی تاریخ قاصر ہے۔

مسلمانوں کے لئے اللہ کی محبت پر کسی بھی دوسری محبت کو ترجیح دینے کے نتائج بڑے بھیانک ہوتے آئے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی اپنے اصل مقصد یعنی اخلاقی و معنوی اقدار سے پہلو تہی کی اور محض مادی ترقی اور عروج کو پیش نظر رکھا، تو ان کو یہ مقاصد بھی حاصل نہیں ہو سکے نہ خدا ہی ملانہ وصال صنم کے مصداق۔ قریبی دور کے ایک داعی و مفکر نے اس کی ایک واضح نظیر پیش کرتے ہوئے سچ لکھا ہے کہ ”..... اس صدی کے شروع میں دو ملکوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ ہماری ترقی مغرب کی پیروی کے اندر پوشیدہ ہے..... ایک ترکی اور دوسرا جاپان..... ان دونوں نے اس صدی کے شروع میں اپنے سفر کا آغاز کیا آج جاپان تو دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں میں ہے لیکن ترکی ابھی تک اسی مقام پر کھڑا ہے“.....

آج دنیا کے نقشہ پر مسلم ممالک کی تعداد ۵۶ ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ مسلمان اپنی قسمت کی تعمیر کے لئے آزاد نہیں ہیں..... وسائل کی فراوانی اور تیل کی بہتات کے باوجود آخر یہ بے بسی اور بے وزنی کیسی؟ پانی کہاں مر رہا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے..... تیل کے ذخیروں کے مالک ملکوں اور خطوں کی طرف تو دنیا متوجہ ہو گئی مگر افسوس اس کا ہے کہ تیل کے چشموں کے مالک یہ ممالک اپنے پاس موجود ایمانی و اخلاقی قوت کے سرچشموں کی طرف دنیا کو کما حقہ متوجہ نہیں کر سکے..... نتائج کے اعتبار سے مادیت پرست دنیا تو اپنے ہدف اور مقصد کے لئے سنجیدہ اور وفادار ثابت ہوئی لیکن آہ! ملت اسلامیہ اپنے اصل مقصد و ہدف سے دور جا پڑی!!! پھر اس کے مغلوب

لے لئے آزاد کیوں نہیں؟

دوسری بری چیزیں ہیں..... طاقت کا نشہ ظلم و جبر مرض اس رقص ابلیس کا۔ خاموش تماشائی کا سی کو جنم دیتی ہے..... البتہ طاقت کے نشہ اور نشہ ہے کہ طاقت کے نشہ کے مقاصد اور نشانے لیکن اسے اپنے مقاصد پر یقین و اعتماد ہوتا (طل) کے مطابق ان مقاصد اور نشانوں پر ان وہ منافقت کا رویہ نہیں اپناتے۔ اس کے مل مقصد اور منصب سے سچی لگن اور وفاداری باطل پر ہونے کے باوجود اپنے مقصد سے لگن ہے اور اس کے برعکس حق پر ہونے کے باوجود مریض کو مغلوب وزیر کر دیتا ہے۔

پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سی پران کا عروج منحصر ہے، لیکن مسلمانوں کا ہے..... مسلمانوں کی ترقی و حفاظت کا (V) کو اپنانے پر ہے اور اس دعوت کو پوری سے متعلق حضور اکرم ﷺ نے عربوں سے عرب اور عجم دونوں کے مالک بن جاؤ گے،

## حالات کی شدت نے

## مسلمانوں کے شعور کو بیدار تو کیا ہے!

حالات اور رفتار زمانہ پر جن کی نگاہ ہے ان کا احساس ہے کہ ادھر چند برسوں سے الحمد للہ ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز عمل اور طرز فکر میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، مثال کے طور پر ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ سہل انگاری مسلمانوں کی ایک خصوصیت اور کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اپنے مذموم مقاصد کی برآوری کے لئے مسلمانوں کو اشتعال دلایا جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کو خاک و خون میں نہلا دیا جاتا۔ ان دنوں بھی ایک طبقہ مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کر رہا ہے، مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی وقتاً فوقتاً کوششیں ہو رہی ہیں، لیکن اسے مسلمانوں کی ہوش مندی اور حکمت عملی ہی کہا جائے گا کہ وہ اشتعال انگیزی پر کسی ایسے رد عمل سے گریز کر رہے ہیں جو خود ان کے حق میں نقصان دہ ہو اور اپنے حریف کے لئے سودمند ثابت ہو۔

ان دنوں مسلمانوں کا طرز عمل اعراض کا ہے ”واعرض عن الجاهلین“ کا ہے، شر پسندوں کو Ignore کرنے کا ہے، مسلمانوں کو برا بھلا کہنے اور انہیں غصہ دلانے کا عمل ایسا ہے جیسے کسی کو اس نیت سے گالی دی جائے کہ وہ بھی جواب میں گالی دے اور اس طرح شرف منہ کو پھیلانے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ گالی کا جواب نہ دینا بز دلی کا عمل نہیں ہے، بلکہ ہوش مندی کے ساتھ اپنے حریف کی چال کو ناکام بنا دینا ہے۔ مسلمان جن تھیٹروں اور طوفانوں سے گزر رہا ہے اور اس کے سامنے ماضی میں اپنی سہل انگاری کے جو تلخ اور تباہ کن نتائج

ماں آج بھی اپنے اصل مقصد و منصب کے رت حال بدل سکتی ہے اور کیا عجب ہے کہ ن“ کافروں نے مکر کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی نے والوں سے بہتر ہے۔ ۵۴:۳) کی صورت ہوان میں باہمی انتشار اور پھوٹ پڑنے میں آگے کی ہے، چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی سے لگائے رہنا ہے جس نے فرمایا ان الدین مناوۃ (ہم سے طاقتور کون ہے؟ ۱۵:۴۱) کا پر پوری طرح قادر ہے! یوں بھی یہ شکست کیا ظالم کو ظالم کہا تو ہے اور مسلمانوں پر دہشت طے میں آج دہشت گردی اور جارحیت کا طوق

یہ تھے قصور اپنا نکل آیا

چاہے تھپڑوں اور طوفانوں اور حالات کی برہمی سختی ہی کو کیوں نہ جاتا ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس رخ پر سوچنے کا رجحان پیدا ضرور ہوا ہے جو ملت کے لئے خوش آئند ہے، ملت میں یہ احساس جاگ رہا ہے کہ اس کے سر سے طوفان گزر رہا ہے وہ طوفان مسلمانوں ہی کو بہالے جانا چاہتا ہے، اس طوفان کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اس مسلمان کا مسلک کیا ہے، یا کس جماعت یا جمعیت سے اس کا تعلق ہے، یا کس حلقہ یا مکتب فکر سے وہ متعلق ہے..... تقسیم در تقسیم کے اس عمل نے ملت کو نیم جاں کر دیا، حالات کی سختی کو آفریں کہنے کہ اس نے ملت کو اپنے اپنے گھر وندوں سے باہر آنے اور اپنے اندر ”امت پنا“ کی صلاحیت و کیفیت پیدا کرنے کی طرف متوجہ تو کیا۔ تلخ نوائی معاف! ملت کو اپنے کو قائم رکھنے اور بقاء و تحفظ کے لئے ”امت پنا“ کی قوت و صلاحیت کی پناہ لینی پڑ گی، اور ان بتوں کو توڑنا پڑے گا جو وحدت امت کی راہ میں حائل ہیں۔

اجتماعیت کیسے قائم ہوتی ہے؟ سمع و طاعت کے جذبہ سے، ایثار و قربانی اور رواداری کے حوصلہ سے!! اس میں کبھی اپنا گھوڑا پیچھے بھی لینا پڑتا ہے! خدا کا شکر ہے کہ علی العموم ملت کے بیدار مغز اور باخبر طبقہ میں بھی اجتماعیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے..... یہ وہ طبقہ ہے جس کو ”جاگا ہوا“ طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سوئے ہوئے کو جگانا آسان ہے، مگر جاگتے ہوئے کو آخر کیسے جگایا جائے لیکن حالات کی شدت کو آفریں کہ ابتلا و آزمائش نے ان جاگتے ہوؤں کو بھی جھنجھوڑا ضرور ہے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یورش و یلغار اتنی سخت ہے کہ اس نے بڑی حد تک مسلمانوں کو اس کا احساس دلایا ہے کہ اگر اس موقع پر ہم نے وحدت کلمہ کی بنیاد پر صف بندی نہیں کی تو ہماری ناعاقبت اندیشی پر مستقبل کا مورخ سر پیٹے گا۔

حاصل کلام یہ کہ حالات کی شدت کی بدولت مسلمانوں کے عوام و خواص دونوں طبقوں میں شعور جاگا ہے، اور مسائل کا ادراک پیدا ہوا ہے، وہ نوشہہ دیوار کو پڑھنے لگے ہیں اور اپنے دانا و نادان دوستوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی ان میں پیدا ہو چکی ہے..... اور قوموں کے رویہ، طرز عمل اور طرز فکر میں مثبت اور تعمیری تبدیلی کسی بڑے

میں، بلکہ عوام کو بھی ہو چلا ہے۔ ملت میں اپنی ن پیدا ہوا ہے، الحمد للہ اس کے مظاہر بھی لگے ہیں اور تعلیمی اور دینی و دعوتی میدانوں

روقی و جذباتی کیفیت کا نام ہے، جبکہ اس کے..... جب انسان حقیقت پسندی سے کام لیتا ہی نہیں ہوتی بلکہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر ہر لینا ایک آسان عمل ہے، جبکہ اپنی کمزوریوں کے لئے حوصلہ چاہئے۔ اس لحاظ سے ملت کا سہل را سے شعور کی بیداری قرار دیا جاسکتا ہے۔

ستان کا بٹوارہ اور ۱۹۹۲ء میں بابر مسجد کی تین واقعات و حادثات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ ہے، ان کے سروں سے طوفان گزرتے رہے جس نے حوصلہ نہیں ہارا اور حکمت عملی نیز رخ کو پھیر دینے کی کوششوں میں لگی رہی..... جو دو بقاء اور Survival کا محاذ، تشخص، ندی کے ساتھ تقسیم کار اور ترجیحات کے نقشے S پروگرام کے عملی خاکے وغیرہ۔

میت کے ہیں، جس دین میں امت کو گاہے کے انتشار سے متعلق ایک دردمندانہ تاثر یہ وہ متفق نہیں ہوگی، لیکن الحمد للہ اس سمت میں ”انتشار سے اتحاد کی طرف رخ“ کا سہرا

وہی پیش رفت دکھائی دے رہی ہے، اسے  
نے کی ضرورت ہے، مطلع ابر آلود ضرور ہے مگر  
نشانہ ہی کی ضرورت ہے، یہ ہلال ”کل کے  
سے کچھ بھی بعید نہیں !!!

## آج مذاہب عالم کو اجتماعی فکر کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ مذہب یا دھرم جو انسان کی رہبری و رہنمائی کا  
فریضہ انجام دیتا رہا ہے، افسوس کہ اسی ”رہبر و رہنما“ کی رہنمائی اور اس کے نام پر استحصال  
میں انسانوں کو تامل نہ رہا۔ اس پر گرفت اور تنقید شاید اس لئے نہ ہو سکی یا عموماً اس سے گریز  
کیا گیا کہ مذہب یا دھرم کو سماج میں تقدس کا درجہ حاصل ہے اس کے برخلاف مذہب  
بیزاروں نے مذہب کو افیون کہنے سے بھی گریز نہ کیا۔ البتہ مصلحین نے جب مذہب کے  
نام پر کسی بھی قسم کی بے راہ روی دیکھی تو انہوں نے لومۃ و لائم کی پروا کئے بغیر اس کو ہدف  
بنایا اس سلسلہ میں متکلم اسلام مولانا مودودیؒ کی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ جب تزکیہ  
واحسان یا مروجہ اصطلاح میں تصوف کے نام پر بے راہ روی اور حد درجہ بے اعتمادی دیکھنے  
میں آئی تو مولانا نے اسے ”چینا بیگم“ لکھنے میں تامل نہ کیا یہ مذہب سے گہرے لگاؤ اور اس  
سے سرمو انحراف کو بھی گوارا نہ کرنے کی ایک مثال ہے۔

مذہب کے استحصال اور اس کے نام پر جنون طاری کر لینے کا عمل تمام مذاہب کے  
لئے لمحہ فکر یہ ہے۔ افسوس کہ مذہب کو آڑ کی ایک ٹٹی بنالیا گیا اور اس کے نام پر نہ جانے کیسے  
کیسے غیر مذہبی کاموں اور ڈھونگ کا سلسلہ جاری ہے۔ اس ”ساختہ“ پر مذاہب عالم کے علماء  
و مفکرین کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔

مذاہب کے ساتھ کھلواڑ کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ مذاہب کو بڑی آسانی سے



ہمیں یہ کہنا ہے کہ مذاہب عالم میں جو اخلاقی مشترکہ قدریں ہیں ان کی بنیادوں پر مفکرین و دانشوران مذاہب کو آواز دی جائے مشترکہ اخلاقی قدروں کو پامال ہونے سے بچانے کی تدبیریں کی جائیں بظاہر بیاباں کی شب تاریک کبھی کبھی مایوسی ضرور پیدا کرتی ہے لیکن دنیا ابھی امن پسند اور اخلاقیات کے علمبرداروں سے بالکل خالی نہیں ہوئی۔

البتہ ایک سوال یہاں یہ کھڑا کیا جاسکتا ہے کہ بعض مذہبی کاروائیوں کے پس پشت خود مذہبی پیشین گوئیاں اور جنونی جذبات کام کر رہے ہیں یہ ایک واقعہ اور حقیقت ہے مگر یہاں بھی شدت پسندوں اور اعتدال پسندوں کا فرق ملحوظ رکھا جانا چاہئے۔ عیسائیوں میں بعض کٹر پنتھی ہیں اور ان کو یہودی کٹر پنتھیوں کی حمایت حاصل ہے۔ نتیجہ میں وہ شدت پسندی کا رخ اپنائے ہوئے ہیں مگر چونکہ ان ہی کی صفوں میں اعتدال پسند بھی ہیں اس لئے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے بظاہر کوئی مذہب یا دھرم امن مخالف ہونے کی اپنی تصویر پیش نہیں کرنا چاہتا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی مذہب اخلاقی و انسانی قدروں سے خالی بھی نہیں ہے۔ اس وقت جب کہ دنیا کے سامنے امن کی غارت گری اور اخلاقی قدروں کی پامالی اس قدر عام ہے کہ ہر شریف النفس انسان (چاہے اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو) ہراساں و پریشان ہے اس کے ساتھ ارضی و سماوی آفتوں کا نزول بھی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور سائنسی وجوہات کے باوجود اخلاقی قدروں کی پامالی کا بھی وہ مشاہدہ کر رہا ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی دنیا ترقی کی شاہراہ کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہیں اپنا سکتی جب تک کہ حالات معتدل اور نارمل نہ ہوں۔ وہ لوگ جو دہشت گردی کے خلاف بظاہر علم بلند کئے ہوئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انہی نے دنیا کے امن کو غارت کیا ہے اس لئے بھی مذاہب کے علمبرداروں کی خصوصیت کے ساتھ یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ دنیا کے حالات کو اعتدال پر لانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ دہشت گردی اگر ہے بھی تو اس کا جواب دہشت گردی سے نہیں دیا جاسکتا، بلکہ مسئلہ کا حل یہ ہے کہ دہشت گردی کی وجوہات تلاش کی جائیں اور انکے استیصال و تدارک کی حقیقی سطح پر کوشش کی

وضع کرنے میں بڑی مہارت و چابکدستی) تہی ہے۔ بنیاد پرستی، انتہا پسندی، اور دہشت مآتھ سامنے آئیں اور دین اسلام کے ماننے نہ دنیا میں کتنی تحریکیں ہیں جو تشدد پر یقین بھی ی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ملامت بنانا اور دوسروں سے صرف نظر کرنا

اگرچہ عام ہیں لیکن رجائیت پسند جماعتوں کو مسلمانوں کے لئے کفر ہے اور دوسری بات جو یاد ہمیشہ مٹھی بھر ہی ہوا کرتے ہیں البتہ ایک فرد منسوبہ بندی کے ساتھ کام کرتے ہیں اور بڑیا جیسے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہیں۔ ذریعہ ذہن سازی کا جو کام کیا جاسکتا ہے، وہ ن میں ششومندر کا جال اس کی ایک مثال ہے م داں کا یہ جملہ اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ مندوستانی ہوں لیکن ذہنیت و فکر کے اعتبار سے ی بھر ہی سہی، لیکن وہ اپنی تعداد میں اضافہ کی میں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ان سازگار حالات یسے افراد ضرور سامنے آ جاتے ہیں جو حق بات بھی خود ہمارے برادران وطن میں ایسے افراد ہیں۔

تدارک کا ہے، اتحاد و اتفاق کا ہے، سردست تو

کرنے کی کوشش نازک کام ہے مذاہب کی ہم آہنگی کا مطلب صلح کا بھی نہیں ہے اور وحدت ادیان بھی ہرگز ہرگز نہیں ہے لیکن جن اخلاقی قدروں کا ہر مذہب احترام کرتا ہے اور جن بد اخلاقیوں کی ہر مذہب مذمت کرتا ہے اس کی بنیادوں پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم کا وجود میں آنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن دنیا کے حالات متقاضی ہیں کہ ایسی ایک مشترکہ جدوجہد کی جائے حاشا وکلا اسے دعوت دین کی راہ میں حائل بھی نہیں سمجھا جانا چاہئے بلکہ حالات یہ ہیں کہ مسلمان برادران وطن کے قریب تو آئیں۔ تمام مذاہب ایک دوسرے کے عقائد سے آگاہ تو ہوں ورنہ صورت حال یہ ہے کہ صدیوں سے ہمسایہ برادران وطن اللہ اکبر کے معنی سے بھی ناواقف ہیں حتیٰ کہ ایک سابق وی سی لکھنؤ یونیورسٹی نے کہا کہ اسلام بھی شاید کچھ Rituals اور رسموں کا نام ہوگا اور بس! اب یہ کس کا قصور ہے کہ برادران وطن مکمل نظام حیات سے ناواقف ہیں اس لئے کہ وہ کتابوں میں بند ہے اور اس کی عملی نظیر دیکھنے کو نہیں ملتی۔

سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں پیش قدمی کون کرے جواب آسان بھی ہے اور مدلل بھی۔ پیش قدمی کرنی چاہئے۔ عصر حاضر کی دنیا میں امن و آشتی کے قیام کے لئے اسلام کے ماننے والوں کو پیش قدمی کرنی چاہئے۔ اسلئے بھی کہ اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ واضح طور سے بتاتا ہے کہ وہ امن و آشتی کا مذہب ہے اور اس لئے بھی کہ موجودہ فضا میں اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے اصل چہرہ پر نقاب ڈال کر اس کو اور اس کے ماننے والوں کو ’دہشت گرد‘ ثابت کر دکھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ موجودہ حالات میں امت مسلمہ کا مایوسی کا شکار ہو جانا اور اغیار کے جھوٹے اور منفی اسلام مخالف پروپیگنڈہ کے سامنے ہتھیار ڈال دینا خود کے لئے بزدل اور مایوس ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے ان حالات کو قدرت کی طرف سے ایک موقع جانتے ہوئے استعمال کرنے کی ضرورت ہے اسلام کی صاف ستھری و نکھری ہوئی شبیہ و صورت کو دنیا کے سامنے مدلل انداز میں پیش کرنے کا یہ ایک ایسا تاریخی موقع ہے جسے اگر صحیح استعمال کر لیا گیا تو عالم انسانیت بھی موجودہ مسلمانوں کا شکر

ب کے علمبرداروں کے بالکل شایان شان نہیں مل نہ ہوں اور ارباب اقتدار امن کے نام پر کے علمبردار نام لیوا بالکل خاموش رہیں یا کسی کی کوشش نہ کریں۔ انسانیت کے نام لیواؤں نے ناگزیر ہے کہ وہ کسی ٹھوس منصوبہ کے ساتھ ت کے اعتدال کے لئے قائم کریں۔

ہم یوں بھی شکوہ سنج ہیں کہ دنیا فاشی، اخلاقی سے آگے بڑھ کر غیر اخلاقی ہی نہیں غیر فطری کے کلچر اور نہ معلوم کس کس قسم کی فرضی ورسی کے لب گور آچکی ہے اور مذاہب کے علمبردار رزواں، انسانی عصمت و عفت ارزاں، انسانی ہی نہیں نہایت نازیبا و نامعقول اور اس پرستم مستقبل کا مورخ اسے مذاہب اور ان کے ب کہ یہی وہ مذاہب ہیں کہ جب باہم مذاہب میں تو باہم دست و گریباں ہونے میں دیر نہیں کے مابین فکری اختلافات اور ان کے اظہار ہی جو تم پیزا رہتی ہے۔

ہوں دیکھ رہی ہے۔ مذہب و عقیدہ بے شک رل نہ ہوں اور دنیا امن کا گہوارہ نہ ہو تو مذہبی نے ہیں۔ ان حالات میں یہ ناگزیر موقع ہے کہ

مشترکہ قدروں میں باہمی میل جول پیدا

حاصل کلام یہ کہ مذاہب کو آڑ کی ٹٹی بنانے والوں اور ڈھونگ رچانے والوں سے بچانے کے لئے نیز اس کے چہرہ کو مسخ کرنے والوں کے خلاف ایک مشترکہ عملی جدوجہد کی ضرورت ہے ورنہ کہیں دنیا ایک بار پھر مذہب بیزاری کا رُخ نہ کر لے۔ ثانیا اس سلسلہ میں امن و آشتی کے سب سے بڑے مذہب اسلام کو پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہے اس لئے بھی کہ اغیار نے کمال ہوشیاری سے بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کی اصطلاحات مسلمانوں کے لئے وضع کر لی ہیں جن کا مسلمانوں کو عملی و فکری اور عملی ہر سطح سے جواب دینا ہے اور مذکورہ بالا اقدام اس میں مدد و معاون ہو سکتا ہے، ثالثاً ہلاکت خیزی اور تخریب کاری کی طرف بڑھنے والی دنیا کا رُخ امن و آشتی اور تعمیر و ترقی کی طرف حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے ساتھ موڑنے کا فریضہ بھی اُمت مسلمہ پر نسبتاً زیادہ عائد ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پیروکار رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔

مذکورہ بالا کام اور پیغام جماعتی سطح پر بھی کرنے کا ہے اور روئے زمین پر اپنا وجود رکھنے والے مسلم ممالک کو بھی اس منصوبہ بندی کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے جو ان شاء اللہ نہ صرف مؤثر و نتیجہ خیز ہوگا بلکہ خود انہیں بھی تقویت و پائیداری بخشنے گا اور وہ نصرت خداوندی کا تجربہ و مشاہدہ کریں گے۔

مسلمانوں کے اس عمل کی جزا بھی خداوند قدوس کے دوسرے پہلو کو بھی مسلمانوں کو نہیں بھولنا سہ موقع پر اپنے فریضہ سے کوتاہی برتی تو اس کو جو جائے گا اور خدا کسی دوسری قوم کو اس فریضہ

ف اور جبر و استبداد کے خلاف سب کو ساتھ لے کر چلا جائے گا۔ کس طرح آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی تھی۔ حالات آقا کے عصر نبوی کو رہتی دنیا تک کے لئے نظیر و رہنما بنایا جائے گا۔ حاصل کرنا چاہئے۔

بجا طور پر قائم کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ شدت پسند مذہبی تنظیمیں اپنی کاروائیوں کی تعلیمات اور پیشین گوئیوں کا سہارا لے کر پیش کیا گیا تو ایسے افراد کی تعداد نسبتاً کم ہے علاوہ ان کے ممالک پر مشتمل ہے وہ تعمیر و ترقی کے یکرے گی۔

منہ پیش کیا گیا تو اس کی پذیرائی ہی ہوگی اس سے تنگ آچکی ہے مسئلہ صرف اتنا ہے کہ تخریب ٹھوس منصوبہ بندی کے ساتھ سامنے نہیں آ رہی تقویت پہنچانے میں اپنی عافیت و سلامتی سمجھات کو باقی رکھنے کی سوچ ہے لیکن شاخ نازک اپنی حقیقت منوا کر رہتی ہے۔

ہے جب کہ وقت نکل چکا ہوتا ہے اور تلافی ہونا بظاہر دکھائی نہیں پڑتا۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجیحات طے کر کے تقسیم کار کے اصول پر اس طرح اسے عملی جامہ پہنایا جائے کہ زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے اور کوئی میدان باقی نہ رہے خصوصاً اسلام جو مکمل نظام حیات ہے، اس کے پیروکاروں کو ترجیحات طے کرنے اور اس کے مطابق تقسیم کار کے اصول کو اپنا کر ایسے پروگرام پر عمل کر کے دکھانا چاہئے کہ دوسری اقوام کے لئے بھی وہ نمونہ بن سکے، لیکن افسوس کہ خیر امت اس پر کما حقہ توجہ نہیں دے رہی ہے۔

سوال تو یہ ہے کہ دعوت کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے آخر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا عام رویہ طرز عمل اور اخلاق و کردار بھی دعوت کی راہ میں مانع بنتا ہے مدارس کے ”دینی قلعوں“ میں بیٹھنے والے یا مختلف اسلامی تنظیموں سے جڑے لوگ اگرچہ کسی حد تک اس سے مستثنیٰ کئے جاسکتے ہیں لیکن افسوس کہ عموماً مسلمانوں کی نہ صرف دین کی طرف سے لا پرواہی اور کوتاہی دیکھنے کو ملتی ہے، بلکہ بے دینی کے کاموں میں ان کے ملوث ہونے کو بھی کھلی آنکھوں دیکھا جاسکتا ہے جب کہ انہیں اسلامی تعلیمات کا چلتا پھرتا عملی نمونہ ہونا چاہئے جو اپنے ہمسایوں کو بھی اثر انداز کر سکیں، ایک طرف تو دین کی طرف سے بے رغبتی ہی نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی ایسا رستہ ناسور ہے جو اس کے وجود کے لئے ہی چیلنج ہے الحمد للہ مختلف دینی تنظیمیں اس معاملہ میں فکر مند و سنجیدہ ضرور ہیں اور اصلاح معاشرہ یا کسی اور تعبیر کے نام سے حتی المقدور اس کے لئے کوشاں ہیں، البتہ یہ پہلو ضرور اور بھرپور توجہ چاہتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کو لازم و ملزوم سمجھا جائے۔ یہ ہمارے نفس کا دھوکہ ہے اگر ہم یہ سمجھیں کہ ازالہ کے بجائے امالہ سے کام لیا جائے تو اصلاح معاشرہ کا کام ہو جائے گا

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم دل کو لاکھ تسلی دے لیں لیکن یہ خود فریبی ہوگی، مثلاً گندگی و غلاظت کے ڈھیر کے سامنے ہم پھول کی ایک کیاری سجا کر یہ سمجھیں کہ اس سے بدبو پر قابو پایا جاسکے گا جس طرح یہ عقل کی ناسمجھی ہے اسی طرح محض ازالہ کے بجائے امالہ کی ذہنیت بھی حرارت ایمانی سے

کے کرنے کا ایک کام

المنکر

بین اصلاح اور غیر مسلموں کے مابین دعوت کا بنیادی کلیدی کام سے گریز کیا یا اس میں کوتاہی رہی اللہ نبی آخر الزماں ﷺ کے صحابہؓ تابعین، تبعیہ اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

سورت حال درپیش ہے اس لئے کہ علی العموم ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کتابوں میں تو اس امر میں دین کی طرف سے لاعلمی اور بے نتیجہ ہے کہ قادیانیت اور اس جیسے دوسرے بھی اور تحریکوں کے مختلف ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے کے لئے منصوبہ بندی سے کام کر رہے ہیں۔ اقوام میں بھی یہ لرزادینے والی کیفیت محسوس زادی جیسے جھمیلوں میں الجھے ہوئے ہیں، ہم رت حال کے پیش نظر یہ ضرور کہنا چاہیں گے رہی ہے، تو میں جب ترجیحات کو طے کرنے کے سامنے آتا ہے اور اس وقت سامنے آتا

مشکل یہ ہے کہ ابلیس لعین کو بہکانے کے لئے جو مہلت ملی ہے اس سے کام لینے میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا ہے جب کہ مسلمان کو زندگی کی جو مہلت اور نعمت ملی ہے اس میں مسلمان کوتاہی اور ناقدری سے کام لے رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ بحر و بر میں فساد پھیل گیا ہے، معاشرہ میں منکرات چوٹی کی طرح دبے پاؤں بھی اور جانباز شہسوار کی طرح دندناتے ہوئے بھی داخل ہو رہے ہیں، برائی کو برائی نہ سمجھنا آج کے معاشرہ کی سب سے بڑی برائی ہے، جب جس مرجائے اور احساس دم توڑ دے تو دنیا میں رقص ابلیس بھی ہوگا اور اس کی داد و تحسین بھی کی جائے گی۔ جب برائی کی طرف بلانے میں لوگ عار نہیں کرتے تو حیرت ہوتی ہے کہ نیکیوں کی طرف لوگوں کو بلانے میں کیوں منصوبہ بندی اور عملی اقدام کرنے میں تاثر کیا جاتا ہے۔ ع ”عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے“ کے مصداق ہم نبی عن المنکر کے موضوع پر بات کرتے وقت دسیوں بہانے تراش لیتے ہیں مثلاً کبھی تو یہ کہ ہم خود گنہگار ہیں دوسروں کو کس منہ سے کہیں، مان لیجئے کہ ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے ہمیشہ گنہ گار رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اگر خدا نخواستہ ایسا ہے تو پھر سوچ لیجئے کہ اللہ کو آپ کیا منہ دکھائیں گے۔ نبی عن المنکر کا جذبہ اور داعیہ اپنے اندر آپ پیدا تو کیجئے پھر اس کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ آپ کے اندرون میں کیسا انقلاب پیدا ہوتا ہے اور اصل چیز اندرون کا انقلاب ہی ہے، ظاہری و برسی چیزیں اصل نہیں البتہ شعائر اسلامی ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے معاشرے سے قدریں بالکل اٹھ نہیں گئی ہیں، ہمارے سماج میں آج بھی خاندانی نظام قائم ہے، دعوتی تنظیمیں قائم ہیں، معاش کے شعبہ جات میں حاکم اپنے خدام و ملازمین پر، معلم و مربی اپنے شاگردوں پر، ماں باپ اپنی اولاد پر، شیوخ اپنے مریدان با صفا پر، بھائی اپنے بھائیوں اور بہنوں پر کیا امر بالمعروف اور نبی عن المنکر کی بجا آوری نہیں کر سکتے چمن کا حسن اور اس کی دیدہ زیبی مالی کی محنت و لگن پر ہے لیکن افسوس ہے کہ نبی عن المنکر کے سلسلہ میں احساس عمل اور احساس زیاں کا ہمیں اتنا بھی احساس نہیں کہ جتنا کہ ایک مالی کے پاس اپنے چمن کے لئے ہوتا ہے۔ گناہوں کا سیلاب ہے کہ بڑھتا چلا

ور نبی عن المنکر کو قرآن نے ساتھ میں بیان طور سے ہے کہ ”تم میں سے ایک جماعت اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں کے لئے ہیں۔“

جہ ہے اس سے اس آیت کے مفہوم و معانی کچھ سامع مجمل اللہ، اتحاد و اتفاق، قومی زندگی، اسلامی نہیں جب کہ مسلمانوں میں ایک جماعت خاص یہ ہو کہ وہ اپنے قول و عمل سے دنیا کو قرآن کی سنت اور برائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت روکنے میں اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ جس جو معروف و منکر کا علم رکھنے اور قرآن و سنت اس ہوں ورنہ بہت ممکن ہے کہ ایک جاہل آدمی اصلاح کا سارا نظام ہی تھیل کر دے یا ایک منکر کی بھی زیادہ منکرات کے حدوث کا موجب ہو تے لگے۔

نبی عن المنکر بھی کبھی ناگزیر ہو جاتا ہے، نبی عن اور اس کے درجہ حرارت پر ہے حضرت ابو بکر سلسلہ میں آخر کیوں اتنا سخت رویہ اپنایا تھا جب ملکہ ایمانی حرارت اور اس کے درجہ حرارت کا سلسلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث میں شخص کسی برائی کو دیکھے تو مقدور ہو تو ہاتھ سے اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔

اجاڑ دے کہ کوئی گمان تک نہ کر سکے کہ یہاں بھی کبھی ایک بستی آباد رہی ہوگی۔

نبی عن المنکر کی خارداری میں ایک رکاوٹ صلح کل کے جذبہ کی بھی ہے ”بامسلمان اللہ اللہ، بابرہمن رام رام“۔ یا ”راضی رہے باغباں بھی، خوش رہے صیاد بھی“ پر عمل پیرا انسان کبھی نبی عن المنکر کی جرأت نہیں کر سکتا وہ صلح کل پر عمل کرتا ہے لیکن ایسی ”صلح کل“ اصلاح طلب ہے۔ یہ مصلحت پسندی ہی کے زمرہ میں آتی ہے اور نفسانی خواہش ہی اسے اس کی طرف مائل کرتی ہے کہ اس کی عزت، مقام و مرتبہ بنارہے۔ بد مزگی نہ ہو چاہے بے عملی یا بد عملی ہوتی رہیں۔ الامان والحفیظ !!!

نور ایک ہے اور ظلمات کئی ایک۔ نور اسلام ہے اور باقی ماندہ ظلمات۔ اس لئے نور کے علمبرداروں کی ذمہ داری ہی اصل ہے لیکن خود مسلمانوں کی اس وقت صورت حال اس قدر ابتر ہے کہ روئے زمین پر واقعی اور حقیقی معنوں میں ایک اسلامی مثالی بستی کے پائے جانے تک کی ہم نشاندہی نہیں کر سکتے جہاں کا ہر فرد اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور اسلامی تعلیمات کی منہ بولتی تصویر ہو۔ لیکن دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے یہاں بھی صورت حال تشویش ناک ہے اور شریف ماں باپ اپنے جگر پاروں کے مستقبل کی طرف سے فکر مند ہیں کہ برائی کی آندھی سے یہ بچے کس طرح محفوظ رہ سکیں، برائیوں سے اجتناب کر سکیں اور اپنے مستقبل کو روشن بنا سکیں۔ معاشرہ کی ابتری کا یہ حال ہے کہ کیا بچے کیا بوڑھے اور کیا عورتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح برائیوں سے قریب ہیں کچھ برائیاں تو واضح ہیں اور کوئی سماج اس سے محفوظ نہیں ہے مثلاً شادیوں میں اسراف، رشتہ داروں میں ناچاکی، سگریٹ نوشی، تمباکو نوشی، شراب نوشی، فلمیں اور لھوالحدیث کے مصداق ٹی وی کا عام چلن اور ان کا ایسا استعمال کہ جو اچھے پروگراموں کو دیکھنے میں کم اور اپنی آنکھیں سینکنے کیلئے زیادہ ہوتا ہے، کمپیوٹر کا غلط استعمال، موبائل کا غلط استعمال، انٹرنیٹ کا غلط استعمال، رشوت خوری، فرض شناسی سے پرہیز اور ڈنڈی مارنے کا عمل، رقص و سرور کی محفلیں اور اس میں داد و دہش، پرنٹ میڈیا میں روزنامے اور ان میں عریاں تصاویر، فحش اشتہارات..... گویا ایک سیلاب بلا ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتا لیکن اس کے ساتھ یہ

لے کر اندر داخل بھی ہو رہا ہے اور ہم اسے نہ بلکہ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ چمن قتی ہے، اس صورت میں خیر امت کے ہر فرد کا

احشر میں کہہ دے

غافل میرے لئے ہے

رے دلوں میں جا گزریں ہو جائے تو ہمارے  
ر کی طرح سے نہیں بلکہ ایک انسانی خدمت  
انے کیلئے چل جائیں اور کسی کل ہمیں چین نہ  
اضطراب تھا جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو  
ما ”لعلک باخع نفسك“..... نبی  
ت سے سب واقف ہیں۔ امت یہ کہہ کر اپنا  
جب کہ ہم کہاں، تو عرض ہے کہ آپ کو امت  
تناؤ و بوجھ جانا چاہئے کہ وہ اس کی شناخت بن

ہائے دور دراز ہیں ان میں شروع کی سطروں  
بات کہی گئی۔ دوسری رکاوٹ مصلحت پسندی  
رے مفاد کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے لیکن یاد رکھنا  
فہم میں ہے اسی طرح نفع و ضرر بھی اللہ ہی کے  
ہے کہ ہمیں اللہ کی ناراضگی کا احساس نہیں جو  
رہم اللہ کی اس ذات کی ناراضگی سے غافل  
ن سے باتیں کرتی عمارتوں اور بستیوں کو ایسا

## بیت المقدس کی بازیابی

۶۳۶ء میں جب بیت المقدس کے گرد مسلم فوجوں کا محاصرہ تنگ ہو گیا تو اس وقت کے شہر قدس کے حاکم پیٹرک صفرائیوس نے محاصرین کی طرف جھانک کر دیکھا اور کہا کہ ہم تم لوگوں سے صلح کے لئے تیار ہیں مگر ایک شرط ہے کہ یہ صلح تمہارے امیر کے سامنے ہوگی اور ہم امیر المومنین کے سامنے یہ شہر تمہارے حوالے کریں گے چنانچہ حضرت عمرؓ مدینہ سے بیت المقدس کے لئے روانہ ہو گئے لیکن اس حال میں کہ آپ کے ساتھ صرف ایک سواری اور ایک غلام تھا۔ یہی وہ موقع ہے جب حضرت عمرؓ نے اپنے غلام سے کہا کہ سواری ایک، اور ہم دو ہیں چنانچہ ہم اس راستہ کو تینوں کے درمیان بانٹ لیتے ہیں اس طرح ایک بار حضرت عمرؓ سواری پر سوار ہوتے، ایک بار غلام سوار ہوتا اور ایک بار سواری کا جانور بغیر کسی سوار کے ان دونوں کے آگے بالکل خالی چلتا یہاں تک کہ جب بیت المقدس کے قریب پہاڑی پر پہنچتے تو آپ کی سواری کرنے کی باری ختم ہو گئی چنانچہ آپ نے غلام کو پکارا اور کہا کہ اب تمہاری باری ہے، سوار ہو جاؤ۔ غلام التجا کرتا رہا کہ خدارا ایسا نہ کیجئے کہ یہ چیز ہماری فتح و نصرت پر اثر انداز ہوگی لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم! میں تو ضرور اتروں گا اور تم ضرور سواری پر سوار ہو گے حضرت عمرؓ سواری سے نیچے اتر گئے، غلام سواری پر سوار ہو گیا اور حضرت عمرؓ سواری کی لگام تھامے ہوئے چلنے لگے اور اسی حال میں کہ غلام سواری پر سوار تھا، حضرت عمرؓ کی سواری قدس کی فصیلوں کے قریب پہنچی اور وہاں نصاریٰ کو اپنے استقبال میں شہر کے باہری دروازے ”باب دمشق“ پر منتظر پایا۔

حضرت عمرؓ ہی کی ذات والا صفات تھی کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایران کی فتح کے موقع پر لکھا تھا کہ میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ہر حال میں اللہ

مسلمان ہی نہیں اور برادران وطن ہی نہیں بلکہ عیثیٰ بھی ہے اور ان کا میلان اور جھکاؤ اخلاقی ہے کہ ویلنٹائن ڈے کی کس قدر شدت سے بال نہ ذہنیت اور عمل کے خلاف عملی طور سے ان کے لئے یہاں اصلاح معاشرہ کے نام پر بڑے بڑے جلسے ہیں جہاں اسراف و فضول خرچی حد سے رنمود و نمائش کے جذبہ کو دخل ہوتا ہے۔

نام مشترکہ سماجی برائیوں کے خاتمہ کے لئے سماجی برائیوں سے لوگوں کو باز رہنے کی طرف سب بھی ہیں اور ہم میں بھی، ہمارے سامنے اللہ عظیم الفضول کی نظیر موجود ہے، ایک حل یہ بھی ایسی اسراف سے بھرپور یا شریعت مطہرہ کے قریبات کی حد تک ہی سہی، تبدیلی آسکتی ہے۔

ہمیں اس بنیادی اصول کو یاد رکھنا چاہئے ”موعظة الحسنه“، مقدور بھر جتنی کوششیں تینوں سے آنکھیں چرانے کا نہیں بلکہ آنکھیں سنہ کے اصول کا ہمہ وقت استحضار رہے، یہ ہم بھی پیدا ہوگا جو دعوت کے لئے ناگزیر ہے۔

سے رکے رہنے پر جو وعید لکھی ہے اسے یاد سب لوگ منکرات میں پھنس جائیں اور کوئی

۱۲۔ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ دشمنوں کے خلاف سب  
راگر جنگی تدبیر ہے، میں تمہیں اور تمہارے  
میں گناہوں سے زیادہ اجتناب کریں کیونکہ  
ہے۔

ح الدین ایوبی کو بھی یاد کر لیجئے جو کہا کرتے  
ت المقدس صلیبوں کے ہاتھوں میں قید ہے  
ب کو ختم کرنے پر پوری توجہ دی کہ وہ کردی،  
اور نتیجہ میں تمام مسلمانوں کو وحدت اسلامی  
ح الدین ایوبی کی رقیق القلبی کا یہ حال تھا کہ  
پ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے جب  
نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہا کہ میں  
میت کرتا ہوں جو تمام نیکیوں کی بنیاد ہے اور

و عمل اور ان کی پاکباز زندگیوں اور پاکیزہ  
فلسطین کا مسئلہ اسلامی مسئلہ تھا نہ کہ محض عربی  
ی راہ عمل اور لائحہ عمل کی ضرورت ہے جو خدا  
نے آپ کو دہراتی ہے دنیا کو انتظار ہے کہ ارض  
ور بیت المقدس کی بازیابی ہمارا مقدر بنے۔

حضرت عمرؓ کے راہ عمل اور صلاح الدین ایوبی

## بابری مسجد کا مسئلہ

### مایوسی کی نہیں، صبر و ثبات اور احتساب کی ضرورت

بابری مسجد کی شہادت کا زخم ایسا ہے جو مندمل نہیں ہوتا اور ہم اسکی یاد سے غافل  
نہیں ہو پاتے۔۔۔ ادھر چند ہفتوں سے ایودھیا اور دیگر مقامات پر رام مندر کی تعمیر کے  
سلسلہ میں کی جانے والی تیاریوں کے مسئلہ کی گونج پارلیمنٹ اور سارے ملک میں سنائی دی  
اور اس طرح ایک بار پھر یہ زخم ہرا ہو گیا۔۔۔ سنگھ پر یوار کی طرف سے ایسے بیانات جاری  
کئے گئے جو جارحانہ بھی ہیں اور ان سے کھل کر عدالت کی توہین بھی ہوتی ہے۔۔۔ سنگھ  
پر یوار کا رام مندر کی تعمیر کے مسئلہ کو عدالت سے بالاتر قرار دینا اور اسے عقیدہ اور عقیدت  
سے جوڑنا بتاتا ہے کہ رام مندر کے سلسلے میں ان کا مقدمہ کس قدر بے جان و بے بنیاد  
ہے۔۔۔ ان کا یہ تاثر دینا کہ عدالت کے علاوہ ہمارے پاس ایک راہ 'قانون سازی' کی بھی  
ہے، ان کی نیتوں کی قلعی کھول دینے کے لئے کافی ہے کہ رام مندر کی تعمیر کا مسئلہ ان کے  
لئے عقیدہ و عقیدت کا مسئلہ نہیں بلکہ اقتدار کے حصول اور دلی کے سنگھاسن پر مکمل گرفت  
پانے کا مسئلہ ہے، رام مندر کا ایٹو (Issue) اس کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے سنگھ پر یوار نے ایک بار پھر  
جارحانہ بیانات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے چنانچہ یہ گھڑی مسلمانوں کے صبر و ضبط اور تحمل اور  
آزمائش کی گھڑی ہے جس میں ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ فریق مخالف کو اشتعال دلانا ایک حربہ  
رہا ہے، اشتعال قبول کرنا دشمن کو کامیاب بنانا ہے اور اس کے برخلاف اس سے صرف نظر



ایودھیا کی متنازعہ آراضی پر کوئی قومی یادگار قائم ہو، کیا عجب کہ اس ذہن کو کبھی اسکی بھی توفیق ملے اور وہ اس رخ پر بھی سوچے کہ بابر کی مسجد کو شہید کر کے ان سے پہاڑ جیسی غلطی ہوئی اور جس کی تلافی صرف یہی ہے کہ اس جگہ پر پھر مسجد تعمیر ہو جائے!!

یہ تو نہ تو خوش فہمی ہے اور نہ ہی نا سمجھی کی بات۔۔۔ یہ بات بابر کی مسجد کے سلسلہ میں کی جانے والی عدالتی چارہ جوئی اور سیاسی سطح پر کی جانے والی کارروائی کی منافی بھی نہیں ہے۔۔۔ اسلامیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کوشش کی جائے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔۔۔ نتیجہ اللہ پر چھوڑنا ہی تو توکل ہے چنانچہ مندرجہ بالا سطروں میں بھی جو بات کہی گئی وہ تعلیمات اسلامی کے عین مطابق ہے۔

دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک عام مسلمان بابر کی مسجد کی آراضی کے حصول اور اسکی تعمیر نو کے تعلق سے کوئی بہت زیادہ پرامید نہیں دکھائی دیتا۔۔۔ کسی قوم میں مایوسی کا درآنا بڑا خطرناک عمل ہے، یہ عمل اسکی قوت فکر و عمل کو فنا کر دیتا ہے اس لئے مسلمانوں کو مایوسی اور پست ہمتی سے بچالے جانا آج وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ مایوسی سے بچنے کی دعوت ان کے لئے قوت و توانائی کا سرچشمہ بنے گی، ان میں احساس عمل جگائے گی اور ان میں جوش و ہوش کا وہ توازن پیدا ہوگا جس نے قوموں کو زندگی بخشی ہے۔

مندرجہ بالا سطروں میں بابر کی مسجد کو شہید کرنے والے مجرمین کے ساتھ خدائے قہار و جبار کی جانب سے حسرت و ناکامی اور بربادی کی چند مثالیں پیش کی گئیں یہ مثالیں ”اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے“ کی تھیں لیکن ڈرتے ڈرتے ملت سے ایک سوال عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ راقم آثم کی گستاخی معاف کی جائے اور اس دعوت فکر کی اجازت دی جائے کہ اس سلسلہ میں رب قدیر کی طرف سے مجرمین کے لئے حسرت و ناکامی سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کے ساتھ رب کریم کی کھلی تائید و نصرت کا مشاہدہ کیوں نہیں ہو رہا ہے؟!!! سوال تلخ ہے لیکن اسکا جواب بھی صاف ہے کہ مسلمانوں کے لئے سر بلندی اور تائید و نصرت کے فیصلے تو اس وقت آئیں گے جب وہ سچے مومن ہونے کی شرط پوری

ہئے کہ بابر کی مسجد کو شہید کر کے بد بختوں نے لیا ہے۔۔۔ واقعات و حقائق اس کی تائید و کے بعد چشم فلک نے سورت کے طاعون اور باسی سطح پر بی جے پی کی تیرہ دن کی حکومت اور اس کی اٹھارہ بیساکھیوں کی ایسی حکومت، بھی دو چار ہے کہ رام مندر کی تعمیر اور یکساں رکھی، دلی کے سنگھاسن پر پہنچ کر اپنے ان ہی پڑا۔۔۔ پھر رام مندر کی تعمیر کے سلسلے میں حکومت پر آفت و مصیبت کے سائے مزید بننے لگے۔۔۔“ کا سلسلہ کھل کر سامنے آنے لگا۔۔۔ نے وقت ہماری نگاہ محض مسٹر بیگڑے، مس جے۔۔۔ اس رب قدیر پر جا کر ٹھہرنا چاہئے جس کے

دل غور ہے کہ اسکی شہادت کے بعد جس شخص بابر کی مسجد شیو سینکوں نے ڈھائی ہے تو اس پر شخص کی زبان سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایودھیا نے۔۔۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے موقف بدلتی، مسجد ہے اور تاقیامت مسجد رہے گی اس ہوتا۔۔۔ لیکن یہ واقعہ اس امر کی تائید کرتا ہے کہ کو پھیرنے والی اور ذہنوں کو موڑنے والی کچھ ہے جس ذہن سے یہ بات ادا ہوئی کہ

## دعوت دین سے غفلت۔ چند تلخ حقائق

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں رہبری و رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی خطوط پر مختلف جماعتوں و تنظیموں نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے لئے علیحدہ علیحدہ لائحہ عمل طے کئے، ان کے اہداف و نشانے اور ان کی ترجیحات (Targets & Priorities) مختلف رہیں۔ اسلام کے منبع و سرچشمے سے پھوٹنے والی یہ دھارا نئی مختلف شعبہ ہائے حیات کو سیراب کرتی رہیں اور بلاشبہ دین کو مطلوب چند ایک تقاضے بھی ان کے ذریعہ پورے ہوتے رہے لیکن ان سب حقائق کے باوجود ایک ایسا پہلو تشنہ رہ گیا جو دین کی اساس اور دین کی بنیاد تھا۔ وہ اساس تھی دعوت دین کی اساس اور وہ بنیاد تھی دعوت دین کی بنیاد! اس صورت میں ایک بڑا المیہ یہ بھی سامنے آیا کہ اسلام کی حیثیت ثانوی درجہ کی ہو کر رہ گئی اور مسلک و مشرب کی ترویج و اشاعت مقصد اولین ٹھہرا اور دعوت دین و احیائے اسلام کا اصل کام پس پشت چلا گیا اس کی مثال یوں ہوئی کہ جس نگینہ کی شعاعوں سے عالم منور ہو رہا تھا اس کی شعاعوں کی تو فکر کی گئی لیکن شعاعوں کے مرکز سے غفلت برتی گئی گویا پتوں کو پانی دئے جانے کے کام کو اصل سمجھ لیا گیا اور جڑ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جڑ کو نظر انداز کر دئے جانے کی صورت میں پتوں کی طاہری چمک دمک اور ان کا حسن و جمال آخر کتنے دن باقی رہ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ درجنوں تنظیمیں، جماعتیں اور جمعیتیں، دین کے نام پر کام کے لئے اٹھیں لیکن وسائل کے باوجود وہ نتائج مرتب نہیں کر سکیں جو مطلوب و مقصود تھے۔ دعوت دین کا کام اساسی نوعیت کا تھا، جو

بد ضرورت ہے کہ ہم اپنا احتساب ضرور کریں  
م سے بغض و عناد رکھا جا رہا ہے، افسوس کہ ہم  
س طبقہ کی ہم سے عناد کی بنیاد یہی ہے کہ ہم  
ہائی میں اس پر بھی غور کر لیں کہ کیا سچ مچ ہم  
م سے پورے ہو رہے ہیں؟۔۔۔۔۔ ہم نے  
را سمیں بڑی حد تک صداقت بھی ہے) لیکن  
”لکھنا بھول گئے ہیں۔۔۔ جس وقت ہم اپنے  
شامل کر لیں گے اور اس سے بھی پوری قوت  
رب کریم کی تائید و نصرت کا بھی نظارہ کریں  
باں مل جائیں!!۔۔۔۔۔ تاریخ اس پر شاہد  
ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی بھی فکر  
میں لیکن خدا کی یاد سے غافل ہو کر اور اپنے  
ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی ”مرض مرض“ کی چیخ و  
۔۔۔۔۔!!

ن سے متعلق اور دین کے نام پر مختلف کام تو روح سے خالی ہیں اور تاثیر سے عاری ہیں۔ امت کہا گیا۔ اور یہ خیر امت اسی صورت میں مابل اور تغافل نہ برتی۔ اللہ کے بندوں کو اللہ سے شروع ہوا اور خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کے سپرد ہوا کہ ”جو حاضر ہے وہ غائب تک بچھا کہ چند حرفوں میں سرکار دو جہاں نے اپنی دیا چنانچہ جاں نثار صحابہ گرام نے اپنے داعیوں سے الوداع کہا، گھربار اور اعزہ واقرباء کو آخرت کی وسعت کی طرف لانے کے لئے کے حاملین کے پیش نظر جغرافیائی حد بندیوں دیکھ سکتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک کتنے صحابہ کرام مدفون ہے؟ جس میں آخری مقام کی اپنی عظمت اور اس کا اپنا تقدس! لیکن مذکر لگن تھی کہ جہاں گئے وہیں کے ہو رہے محض کی پاک آرزو لے کر نہیں بلکہ ان بشارتوں کو بنا کر تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں اور چھا جانے کا شکوہ ہے لیکن ہمیں اپنے آپ بھیلانے اور بکھیرنے سے مجرمانہ غفلت برتی۔ کہ وہ مدعو ہو کر رہ جائے خصوصاً اس حالت کے شعائر ہدف اور نشانے پر ہیں اس صورت میں ہی کے لئے ضروری نہیں بلکہ خود امت کے

بقاء و تحفظ کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ ایک چوکیدار کا کام چوکیداری ہے اگر وہ اس سے غفلت برتا ہے تو مالک کو حق ہے کہ وہ اسے اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دے دعوت کا کام بھی اس امت کی اصل ذمہ داری ہے اگر وہ اس سے چشم پوشی کرتی ہے تو رب قدیر کسی کا محتاج نہیں، وہ اس کام کے لئے دوسری قوم کو لا کھڑا کرے گا۔ دعوت کے کام سے غفلت شعاری کے بعد اس امت کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

### تبلیغ اور مناظر کے مابین کوئی رشتہ نہیں

دعوت کا بنیادی اصول حکمت و موعظت حسنہ ہے اسلام اکرام انسان سکھاتا ہے وہ کسی کی اہانت کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ باپ دادا کے مذہب سے یک گونہ لگاؤ اور اسلام کی حقانیت و صداقت سے ناواقفیت کی وجہ سے ایک شخص کا حق بنتا ہے کہ اس کو دین سے واقف کرانے کا کام حکمت و موعظت حسنہ کے اصول کی پاسداری کے ساتھ کیا جائے۔ مناظرہ سے تبلیغ کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس سے خلیج کا پائنا تو درکنار، خلیج کے بڑھنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ داعی تبلیغ دین کا ختم ہوتا ہے اور محبت و حکمت سے اس کی آبیاری کرتا ہے۔ اس کی مثال ایک کسان کی ہو سکتی ہے، ایک سرجن کی نہیں ہوتی اس لیے اسلام کی سر بلندی کی ہزار طلب صادق کے باوجود اسے اپنے مدعو کے دل کو زخمی کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ دعوت کا کام تو کار شیشہ و آہن ہے اور بڑا نازک ہے دلازاری کی تو معمول کی زندگی میں بھی اجازت نہیں اور کسی کا دل توڑنا تو بڑا سنگین کام ہے، دعوت میں مناظرانہ انداز اپنانے کی روش دلازاری کی طرف لے جاتی ہے۔

### دعوت، دل کو پہلے اپیل کرتی ہے

دعوت دین میں کسی کو محض چپ کر دینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ داعی کا کام اور کمال یہ ہے کہ وہ اپنی بات مدعو کے دل میں اتار دے۔ یہی وجہ ہے کہ قبولیت اسلام کے اکثر واقعات کا تعلق اسلامی تعلیمات سے کسی کے دل کے متاثر ہو جانے کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں

(۱) اسلام کا ایسا سیدھا سادہ اور صاف ستھرا تعارف کرانا جو کتاب و سنت میں مذکور ہے۔ مثلاً قرآن پاک نے توحید کو جس سادہ و دلنشین انداز میں پیش کیا وہ ایک عام اور سادہ انسان کو بھی اپیل کئے بغیر نہیں رہتا اس کے لئے کسی فلسفہ آرائی اور نکتہ آفرینی کی ضرورت نہیں۔

(۲) کلموالناس علی قدر عقولہم کے اصول کے تحت اسلامی تعلیمات کو نئے سائنٹفک انداز میں پیش کرنا اور اس طبقہ کو مدلل انداز میں اسلام کی صداقت اور اس کے دین فطرت ہونے کو اس طرح ذہن نشین کرانا کہ مختلف شعبہ ہائے حیات کے ماہرین اور تعلیم یافتہ حضرات اس سے متاثر ہوں اور عقلی و منطقی اور دلائل کی راہ سے بھی ان حقائق کو سمجھنا ان کے لئے آسان ہو سکے۔

(۳) اسلام سے متعلق غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کے پیدا کرنے کی کوششوں کے ازالہ کی منصوبہ بند کوشش کرنا اور اس کے لئے ذرائع ابلاغ تحریر و تقریر اور جو بھی وسائل میسر ہوں ان کو اختیار کرنا۔ غلط فہمی کے ازالہ میں انداز تفہیم کا بھی ہو اور اقدامی بھی، دفاعی انداز اختیار کرنا اسلام کو گویا کٹھرے میں لاکھڑا کرنے کی کوششوں کو رسید دینا ہے خصوصاً مستشرقین نے تشکیک کے جو جراثیم پیدا کئے ہیں اور عامۃ الناس اور پھر عامۃ المسلمین کو ذہنی و تہذیبی ارتداد میں مبتلا کرنے کی جو کوششیں کی ہیں اسکے ازالہ اور استیصال کے لئے علمی اسلوب میں اور مدلل انداز میں تحریر و تقریر کی ضرورت ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق اس سلسلے میں بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ موجودہ زمانہ میں براہ راست ان موضوعات و مسائل پر خصوصی توانائی لگائی جائے جن موضوعات و مسائل کی موجودہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ترسیل و تشہیر کی جارہی ہے اور جس کی بدولت ایک عام ذہن بھی متاثر ہو رہا ہے۔

(۴) دعوت دین کا ایک اہم تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان روئے زمین پر ایک ایسے صالح مسلم معاشرے کی تشکیل کے متعلق کوشاں و فکر مند رہیں جہاں اللہ کے بندے اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کو رو بہ عمل ہوتے ہوئے دیکھ سکیں اور جہاں ایک عام انسان کی

قبولیت اسلام کے واقعات کا تناسب ہے تو  
ری ہے۔

اسلام کے واقعات کے تجربات کی روشنی میں  
س ایک تو اپنے آپ کو ان صفات اور اخلاق  
اور جو اخلاق و کردار دوسروں کے لئے اپنے  
ہوں میں جو نقش ہیں، انہیں نفس میں اتارنے  
سلامی معاشرہ اور اس کے افراد اور ان کا قول  
۔ اسلامی معاشرہ اور اس کے افراد کی اخلاق  
یوں کی ذہن سازی کا فریضہ ہے۔

ب ہیں اول تو کتاب و سنت کا علم اور اس میں  
س کو برتنے کا سلیقہ، مخاطب کے مذہب سے  
ہوا لیکن اصل چیز ہے داعیانہ تڑپ، درد و سوز،  
گ سے انسانوں کو بچانے کا حقیقی کرب  
، انابت الی اللہ، خشیت الہی اور تعلق مع اللہ  
ہتھیار ہیں، نالہ نیم شمی، قادر مطلق کے حضور  
کے ذریعہ دلوں کو فتح کراتی ہے۔

ی اور چند اصولوں کی پاسداری کا طالب ہے:

عجب و خود پسندی کو ظاہر کرتی ہے اور اسلام کے مقابلے میں اپنی جماعت یا جمعیت سے وفاداری کا اعلان سناتی ہے آرزو اعلیٰ کلمۃ الحق کی ہونی چاہئے نہ کہ اپنی جماعت کے پرچم کو سر بلند دیکھنے کی تمنا۔ یہی وہ مغالطہ اور نفس کا دھوکہ ہے کہ دل کی تھاہ میں تو دنیوی آلائشیں ہوں لیکن ظاہر داری میں کام دین کا کیا جا رہا ہو۔ مستقبل کا مورخ مسلمانوں کی درجنوں دینی تحریکوں، تنظیموں، جماعتوں اور جمعیتوں کے اپنے اپنے دائرہ کار میں بظاہر سرگرم عمل ہونے کے باوجود علیٰ العموم مسلمانوں میں آخری درجہ کی دین سے دوری و بے رغبتی کے پائے جانے کا جب بھی تجزیہ کرے گا تو وہ اس امر کو ضرور اجاگر کرے گا کہ دین کے نام پر اٹھنے والی جماعتیں اور جمعیتیں ایک دوسرے کی رقیب رہیں، رفیق بن کر نہیں رہ سکیں اور ہر جماعت کو خود کے کشتی نوح ہونے کا دعویٰ رہا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت جماعت اور جمعیت کی تو باقی رہی لیکن اسلام کی دعوت کا کام اور اس کی ذمہ داری کا احساس پس پشت چلا گیا۔

### محدود میدان کار اور مسلسل جدوجہد

(۶) دعوت دین کا کام کرنے والوں کے پیش نظر یہ اہم نکتہ رہنا چاہئے کہ وہ دعوت دین کے لئے ایک میدان یا ایک علاقے یا ایک بستی کی تعیین کریں اور پھر اس کو اسی طرح میدان کار بنائیں اور اس پر اپنی توانائیاں صرف کریں جس طرح ایک کسان اپنے کھیت پر کرتا ہے، زمین کو ہموار کرتا اور تخم ریزی کے لئے اس کے سازگار ہونے کی فکر کرتا ہے، وقت آنے پر اس میں تخم ریزی کرتا ہے، اس کی آبیاری کرتا ہے، فصل کو کیڑے کھوڑوں سے محفوظ رکھنے کے لئے چوکس رہتا ہے اور نتیجہ میں وہ فصل تیار ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی اہم کام Target اور ہدف و نشانہ مقرر کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا زندہ قومیں اس کا شعور رکھتی ہیں اور یہ ان کا شعار اور طریقہ کار ہوتا ہے۔ ہدف اور نشانہ پر تسلسل کے ساتھ محنت و کاوش ہی رنگ لاتی ہے، میدان کار اور دائرہ کار اگرچہ محدود ہوں مگر مستقل مزاجی اور تسلسل سے وہ بڑے اور نمایاں نتائج پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں اور مرحلے وار اور تدریجاً کام کو آگے

کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔

ایک نہایت افسوسناک اور حیرتناک امر ہے اسلامی سماج یا ”مثالی اسلامی معاشرہ“ کہاں کے چلتے پھرتے عملی پیکر دیکھ سکیں اور ان کی ف اسلام کو سیکھ سکیں تو دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے اسلامی بستی کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی اگر کے دینی ادارے بھی ہیں ان کی خانقاہیں بھی اور حتی المقدور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ان سب کے باوجود ادخلوانی اسلام کافہ کی عملی مسلمانوں میں نظر نہیں آتی۔ مکمل نظام حیات ہے کہ یہ ملت مدعو بن کر رہ گئی ہے اور اپنے دیا ہے۔

دوں میں یہ بات دل کی گہرائیوں میں اتر جانا انسان کے بھی واقعاً قائل ہوں، داعی کا منصب پائی جانے والی کسی بھی نوعیت کی تنگ نظری کا سبب بن سکتی ہے۔

### سبق نہ کہ رقیب

یہ ہو رہی ہے کہ دین کا کام کرنے والی ایک کا مظاہرہ کرنے میں نہیں چوکتی اور اس کے کے طریقہ کار میں کیڑے نکالنے میں اسے سمجھنا اور دوسرے کے طریقہ کار کو ناقص سمجھنا

ہوتے ہیں اور نتیجے میں مادیت کی دوڑ میں فارغین مدارس بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

فارغین مدارس ہی قصور وار نہیں۔

لیکن اس میں سارا قصور صرف فارغین مدارس ہی کا نہیں ہے اس پر غور کرنے کا ہم میں حوصلہ ہونا چاہئے کہ ہمارا معاشرہ مؤذن و امام اور مدرسے کے ایک استاذ کے ساتھ واقعی کیا سلوک کر رہا ہے فقہ کے ماہرین کو چاہئے کہ وہ آسمان کو چھوتی مہنگائی کے اس دور میں اپنی اصطلاح ”بقدر کفاف“ پر نظر ثانی کریں اور شان توکل کی معراج پر اپنے فارغین کو پہنچانے کے لئے کوئی نئی اصطلاح اور تعبیر ایجاد کریں جس سے وہ اپنے دل کو بہلا سکیں۔ فارغین مدارس کا معاشی خوشحالی کے لئے کوششیں کرنے میں ان عوامل کو نظر انداز کرنا حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے بہر حال یہ ایک مستقل بحث ہے جس کے لئے ارباب مدارس ذہنی و فکری طور پر تیار ہوتے دکھائی نہیں دیتے اس لئے اسے طول دینا لا حاصل ہے۔ پڑوڈالر کی ریل پیل نے اکثر فارغین کو مدارس کے قیام کے ذریعہ اپنی خاندانی معاشی خوشحالی کی آسان راہیں سمجھادی ہیں، قصور فارغین مدارس ہی کا مان لیجئے کہ علی العموم وہ مادیت پسندی کی ڈگر کو اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود اصل سوال دعوت دین کا اور اس کے لئے مطلوبہ صلاحیتوں کے داعی علماء کا باقی رہتا ہے۔ بات صرف مادیت کی دوڑ میں ان کے شامل ہونے کی حد تک کی ہی نہیں ہے، اس لئے کہ معاشی خوشحالی اور دعوت دین کے کام میں کوئی ٹکراؤ بھی نہیں ہے۔

دودہائیوں کے گزارنے کے باوجود دعوتی کسک کی رمت کیوں نہیں؟  
اہم سوال اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ آخر تقریباً ڈیڑھ ڈیڑھ دہائیوں تک دینی تعلیم کے حصول میں اپنی عمریں کھپانے والے ان فارغین میں سے کتنے فیصد ایسے ہوتے ہیں جن کے سینوں میں مدارس نے داعیانہ تڑپ پیدا کر دی ہو، دعوت کی کسک انہیں کبھی تنہائی میں رلاتی ہو اور بے چین و مضطرب کر دیتی ہو گستاخی معاف، ایک بڑی تعداد میں دعوت دین کی

بہت ضروری ہے۔

بے رغبتی

کرام کو علم میں جس رسوخ اور باطن کی جس غذا اور روحانی سرمایہ کی ضرورت لاحق ہوتی افراد کی تیاری اور فراہمی کی توقع بجا طور پر عربیہ کے فارغین عموماً مدرسہ کی چہار دیواری ہی سے ہیں گویا ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ مدارس میں وہ قرآن وحدیث اور فقہ کے علاوہ ادب سمیت ہیں ماشاء اللہ مدارس عربیہ کا جال بچھا ہوا افادیت کا ادراک و شعور فارغین مدارس سے ہے کہ مدارس عربیہ ان کے ہدف اور نشانے ماب پر اشکالات، اور اصلاحات کا سلسلہ اسی کھم المناک نہیں ہے۔ علم برائے زندگی کے رس کے فارغین کے بھی اعصاب پر سوار ہے اس داخلہ کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں یا ٹوٹی پھوٹی ممالک کا رخ کرتے ہیں اس سے بے پرواہ میں کوئی ہم آہنگی ہے بھی یا نہیں یونیورسٹیوں غریض کا نشانہ بنایا جاتا رہا لیکن حالات کے اس کا مقصد و منہا بھی ”دوکف جو“ ہی ہو کر رہا ظاہری چمک دک اور مادیت پسندی ان کی اصل معنی و مفہوم انہیں بے معنی معلوم

کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جہاں کی خاک سے مفسرین و محدثین اور فقہاء کرام کے ساتھ داعیان دین پیدا ہوں جو اپنے ہمسایوں میں دعوت دین کے کام کے لئے مطلوبہ صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ارباب مدارس اس سے غافل ہیں اور اس پہلو پر ان کی نگاہ ہی نہیں، چنانچہ مدارس کے فارغین کے لیے باقاعدہ شعبہ دعوت و ارشاد یا الدعوة کے شعبے قائم ہیں، البتہ بصد احترام عرض ہے کہ دعوت دین کے یہ شعبے ارباب مدارس کی مزید توجہ کے محتاج ہیں، ان طلبہ کی محض کتاب خوانی ہی کافی نہیں، ان کی عملی تربیت کی بھی ضرورت ہے، ان کی ذہن سازی اور فکر سازی کی ضرورت ہے، اس میدان کے نشیب و فراز اور اس کے تلخ و شیریں تجربات سے ان کے براہ راست واقف ہونے کی بھی ضرورت ہے دعوت دین کے یہ شعبے ارباب مدارس کی براہ راست سرپرستی و رہنمائی اور نگرانی و توجہ کے شدید محتاج ہیں۔ اس سے بے اعتنائی کی مثال تو ایسی ہوئی کہ برسوں کی محنت کے بعد ایک لہلہاتی ہوئی فصل تیار ہوئی اور اس سے آپ نے ایسی اپنی شان بے نیازی برتی کہ چاہے وہ مٹی کی نذر ہو جائے یا قزاقوں اور لٹیروں کی۔

داعیانہ منصب کا احساس غالب آ سکتا ہے

دعوت دین کے بنیادی اصول حکمت و موعظت حسنہ سے امت کے منصب و مقام کی ذمہ داری کا احساس حالات کی ناسازگاری کے احساس پر غالب آ سکتا ہے اور نقشے اور صورت حال کو بدل سکتا ہے۔ ایک کنکر سمندر میں ارتعاش پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو کیا نعوذ باللہ اللہ کے پاک نام اور اس کی طرف پکار تاثر سے خالی ہو سکتی ہے! جہنم کی آگ سے بچانے کا جذبہ صادق کیا پتھر دلوں کو موم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا! سماجی عدم مساوات اور اس کی بناء پر ظلم و ستم سے دوچار طبقات کو دین فطرت کا اصول مساوات کیا انہیں مائل بہ حق نہیں کر سکتا! خدا مجھے معاف کرے محسوس ہوتا ہے کہ دعوت دین کے فریضہ کی ادائیگی کا بنیادی احساس ضمنی مسائل کی تہ میں دب گیا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ملت مسائل

میں اسلامی شعائر کی پابندی اور ان کا احترام ایک بے مقصد بھیڑ دکھائی دیتی ہے، بے نیکی کا رارس کی اسناد کو پل بنا کر اس راستے پر بھیڑ کی عالم بیزارگی میں جیل سے فرار ہو کر اب کہیں ہو۔

ناک و کر بناک المیہ! جس کی وجہ سے عمارت ماں تو مستشرقین کا انہماک اور بدنیتی کہ وہ ب ڈھونڈھنے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف مانوں کے عقیدوں کو متزلزل کرنے کی کوشش میں اور فارغین کہ عمر کا ایک خاصہ اور عمر کی سن کے داعیے اور جذبے، اسلام کی بقاء و تحفظ تک بھی ان میں پیدا نہ ہو یا للجب!

نیب جوئی نہیں، اور نہ اس کا اطلاق سو فیصد ہے مدارس اسلامہ حالات کی نامساعدت، باوجود نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ملک نہ تدابیر ہو سکتی ہیں، انہیں حتی المقدور اختیار مختلف صورتیں ہیں، وہ انہیں اپنائے ہوئے انکار نہیں کر سکتا کہ خاتم بدہن خدا خواستہ اگر می اور جس سطح کا بھی دین نظر آ رہا ہے، چند رس کی خدمات سے صرف نظر کرنا حقائق کو اتنی ہے کہ مدارس میں تعلیم و تربیت اور ذہن کے کام اور اس کی اہمیت کو ترجیحات میں شامل

دل گئی ہے، داعیانہ جذبہ سرد پڑ گیا ہے یا یوں

اس کمتری پیدا کر دیا ہے ہمیں اس خول سے  
کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ہم داعیانہ جذبے  
کھڑے ہوں ورنہ آنے والی تسلیں ہمیں اس  
اپنی توانائیاں دفاع میں خرچ کیں اور اپنے  
بالکل اسی طرح جس طرح ہم تقریباً سات سو  
کی صلاحیتیں توسیع پسندانہ کوششوں، حسن کی  
ہوئیں اور جذبہ تبلیغ و اشاعت دین سے بے  
سے (الامشاء اللہ) وحشت ٹپکتی ہے اور دوسری  
رافات سے قطع نظر ان کے مرقد، مرجع خلافت  
کے سامنے بھی تھی لیکن دعوت و اشاعت دین کا  
دین غالب ہونے کے لئے ہے۔

صرف دہلیز پر دستک دے رہا ہے بلکہ اس میں  
برے معاشرہ پر مرتب ہو رہے ہیں۔ جرائم کا  
پاس کیا راستے ہیں کہ یا تو خدا نخواستہ خس  
والہ کر دیں یا اس معاملے پر سر جوڑ کر بیٹھیں۔

ہے تو وہ فی نفسہ صحیح ہیں اور یہ ان کے اچھے اور  
و تے ہیں۔ یہ سوچ کہ علی العموم معاشرہ کا ضمیر  
کے علاوہ غیر مسلم ہمسایوں میں بھی کثرت سے  
طرب و بے چین ہیں اس صورت میں ذرائع

ابلاغ کے زہر کو کم کرنے کے لئے ہمیں متبادل نظم کرنا چاہئے۔ الحمد للہ دعوتی کام کے سمت  
میں ہند اور بیرون ہند میں کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن اس کا دائرہ کار اور دائرہ  
اثر محدود ہے۔ البتہ آغاز ہوا تو ہے۔ پہل ہوئی تو ہے۔ اس موقع پر ناچیز ایک بات ان  
زندہ دلان ملت سے عرض کرنے کی اجازت چاہے گا کہ فحاشی سے بیزار و عاجز برادران وطن  
کو بھی ایسے پروگراموں میں شامل کرنے کیلئے حکمت و تدبیر کے ساتھ تدریجی طریقہ سے  
صرف مذہبی پروگرام کے علاوہ کچھ اخلاقیات پر مبنی دلچسپ پروگرام بھی شامل کئے جائیں۔  
کچھ دلچسپی تو پیدا ہو پھر اللہ مقلب القلوب ہے اور وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے۔

ذرائع ابلاغ کے سلسلہ میں اگر صحیح العقیدہ لوگ آگے نہیں آئیں گے تو داخلی  
خطرات بھی منہ پھیلانے لگے ہیں۔ ایسے بااثر و اہل ثروت اس میدان میں آئیں گے  
جو اسلامی فکر کو چیتا بنا کر پیش کریں گے اور اسلام کو محض رسوم و رواج اور خرافات  
و توہمات کا مذہب بنا کر پیش کریں گے۔ اور تدبیر الٹی پڑے گی۔ یہ بات تو مسالک  
و مشارب کی بات ہے لیکن اس سے آگے کا مرحلہ بڑا پرخطر ہے۔ اسلام کے نام پر باطل  
فروں کی ریشہ دوانیوں کا مسئلہ! قادیانیت نے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ جن فتنہ سامانیوں کا  
جال بچھا رکھا ہے اس کا صحیح ادراک و شعور وہی حضرات کر سکتے ہیں جو براہ راست ذرائع  
ابلاغ سے وابستہ ہیں اور اس کی بھرپور واقفیت رکھتے ہیں۔ دجل و فریب قادیانیوں کا شیوہ  
ہے جس سے وہ کمال ہوشیاری سے کام لے رہے ہیں۔

ایک طرف تو الحمد للہ دنیا میں اسلام کے تعلق سے جستجو پائی جاتی ہے اور جدید تعلیم  
یافتہ اور کھلے ذہن کا یہ طبقہ انٹرنیٹ اور دوسرے ذرائع سے اس تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے۔ لیکن  
نئے عیار و مکار شکاری پہلے ہی ایسا جال بچھائے ہوتے ہیں کہ وہ اسلام کی صحیح تصویر  
سے آگاہ ہونے کے بجائے باطل مذہب کے دام فریب میں آجائیں۔ کتنے ویب سائٹ  
اور کتنے ڈاٹ کام ایسے ہیں جو اسلام کے نام سے جڑے ہیں۔ لیکن اصلاً وہ اسلام کی بیخ کنی  
، اس کی غلط تشریح و تصویر کشی کیلئے ہیں۔



کی۔۔۔ چنانچہ آج نہ ہماری کوئی آواز ہے نہ خبر رساں ایجنسیاں بلکہ خبروں کے جاننے کے لئے ہم ان ہی یہودی خبر رساں ایجنسیوں کے محتاج ہیں جن کے رگ وریشہ میں اسلامی دشمنی سرایت کئے ہوئے ہے۔

رہا امریکہ بہادر، اس کے حلیف اور اس کے بغل بچہ یہود کی اسلام دشمن سازشیں تو وہ اظہر من الشمس ہیں، فرقان الحق کے نام سے جس کتاب کی اشاعت کی گئی ہے اور مغالطہ دیکر اسے قرآن کا نام دے کر اسے جس طرح پھیلا جا رہا ہے اور اللہ کی نازل کردہ کتاب قرآن مقدس کی امریکی فوجیوں نے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ جس طرح بے حرمتی کر کے مسلمانوں کی ذہنی اذیت کا سامان کیا ہے اس سے ہر خاص و عام واقف ہے فرقان الحق نامی مذموم کتاب کی حقیقت اور اس کی جزئیات کو بھی بے نقاب ہونا چاہئے ورنہ ان باطل قوتوں کے مادی وسائل اسلام اور حق کے متلاشیوں کو گمراہ کرنے میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ امور تو یہی بتاتے ہیں کہ اسلام کی بیخ کنی اور اسلام دشمنی کے لئے جتنی منصوبہ بند اور ٹھوس کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اسکے بالمقابل دعوت دین کے لئے اس قدر منصوبہ بند ٹھوس کوششیں نہیں ہو سکیں۔ الحمد للہ، اللہ کے چند با توفیق نیک و پاکباز اور دردمند افراد اس راہ میں جو کچھ بھی ٹوٹی پھوٹی کوششیں کر رہے ہیں، اللہ ان میں اخلاص و برکت دے اور انہیں ثمر آور بنائے۔

ذرائع ابلاغ کے تناظر میں دعوتی کام کے سلسلہ میں جو خاکہ پیش کیا گیا وہ بے رنگ رہے گا اگر عامۃ المسلمین اسلامی تعلیمات و احکامات سے بیگانہ رہے اور زمینی سطح سے جڑے ہوئے نہیں رہے ورنہ مذکورہ بالا خاکہ ایک فضائی قلعہ ہو گا یا ریت کا ایسا گھر وندا جس کے وجود کو ختم کرنے کے لئے ہوا کا ایک جھونکا ہی کافی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی رحمت کو متوجہ کئے بغیر دین کی اشاعت کا بیج کبھی برگ و بار نہیں لاسکتا۔

دعوت دین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ جو ہمارے اپنے ہاتھوں کی وضع کردہ

A کا ہے ان کے مستند ہونے کا ہے اور اس کا صحیح العقیدہ معروف و مستند ادارے اور جماعتیں کو تذبذب اور کنفیوژن میں ڈالنے بغیر بنیادی سب سائٹ اور ڈاٹ کام کھولیں۔

سرنے کی جسارت کروں گا کہ اداروں اور ان کا مستند ہونا اور ایک دور دراز کے ناظر کیلئے حکامات پردی جائے۔ اطلاعاتی انقلاب کے دونوں ذرا سی بھی غفلت برتی گئی تو خد خواستہ باتیں ہوئیں جو بظاہر گھر کے بھیدی ہیں اور ادھر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر ملت واحدہ کے اصول کے تحت یہودیوں مسئلہ مستشرقین کا ہی نہیں رہا بلکہ باطل اپنے

کئی پڑتے ہیں، نام ہی کے اعتبار سے سہی لیکن اس کی اصلاح کے نام پر۔۔۔ دنیا بڑی وسیع کیا یہ تصور کرنا محض خام خیالی ہوگی کہ اسلام ک لوگوں میں تشکیک کے جرائم نہیں پیدا کرتا پیغام اور صحیح موقف کو پہنچانے کا ذریعہ ذرائع فہم فہم صحرائے عرب سونا اگل رہا تھا ورلڈ آرڈر کو بظاہر اور شاہ فیصل مرحوم اس سیال سونے کو ر رہے تھے افسوس کہ ان دنوں عالم عرب کی رات کے تدارک کی کوئی عملی تدبیر نہیں

حق خود کسی صحیح فکر کو اپنانے والے ہو جائیں گے۔

دنیا کے ایک بڑے حصہ میں مسلمان ایسی پوزیشن میں لا کر کھڑے کر دئے گئے چنانچہ ان کی توانائیاں دفاع میں صرف ہوتی رہیں اور وہ اپنے وجود اور survival کی لڑائی لڑتے رہے۔ کچھ مقامات میں ایسا بھی ہوا کہ سیاست اور مذہب کو ایسا گڈ مڈ کر دیا گیا کہ جو دراصل سیاسی جدوجہد تھی اسے مذہبی رنگ دے کر آگے بڑھایا گیا اور شوق شہادت کے نام پر جاں نثاری کا ایک سلسلہ شروع ہوا نتیجہ میں لاکھوں افراد اس کی نذر ہو گئے ماں کی گودیں اپنے لعلوں سے خالی ہو گئیں اور سینکڑوں بہنوں کا سہاگ اجڑ گیا۔ کتنے خاندانوں کے چراغ گل ہو گئے۔ ملال اس کا ہے کہ یہ سب تحریک کے نام پر چلتی رہی اور دوسری طرف صورت حال ایسی بدلی کہ دینی لحاظ سے زمین پیروں تلے سے نکلتی چلی گئی غربت افلاس، ماں باپ کی یہ فکر کہ ان کے جگر گوشے ان شورش زدہ علاقوں سے نکل جائیں اور کہیں عافیت پا جائیں، ان باتوں نے باطل تحریکوں کو آسانی فراہم کی کہ وہ وہاں اپنا جال بچھا دیں، چند برسوں پہلے قادیان جانا ہوا وہاں میں نے بڑی تعداد میں کشمیری بچوں کو زیر تعلیم پایا، ان کے ماں باپ کے سامنے مسئلہ جان کی عافیت کا ہے پھر شکاری ایسا جال بچھاتے ہوں گے کہ جان کی امان ہی نہیں، اس میں ایمان کی سلامتی بھی اور تعلیم و تربیت بھی ہے، دشوار گزار حالات کے مھنور میں عوام ان کے جال کو کنج عافیت سمجھتے ہیں اور اپنے بچوں کی جان کو سلامت دیکھنے کی آرزو میں ان کو جلاد کے حوالے کر دیتے ہیں۔ دین کے نام پر تنظیم چلانے والے اور اپنے لہو سے زمین کو سینچنے والے اس بدترین صورتحال کی طرف توجہ نہیں دیتے جس سرزمین پر دین کے لئے تحریک پیا ہے اسی کا نقشہ چند برسوں میں دین سے لاتعلق کر دینے کی منصوبہ بند کوششیں جاری ہیں۔

یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جن مقامات پر ہم کثرت میں رہے وہاں بھی ہماری ترجیحات (priorities) میں دعوت دین شامل نہیں رہا۔ حکمت و تدبیر کے بجائے جوش و جذبہ ہم پر غالب رہا چنانچہ اسی لحاظ سے ترجیحات بھی طے ہوتی رہیں۔

لے بارے میں نہیں معلوم کہاں تک یہ روایت دنوں وہ دھرم کی تبدیلی پر سنجیدگی سے غور کر اسلام کی ترغیب دینے گئے تو چونکہ ان کا اسلام کا داخلی انتشار سے بھی واقف تھے اس لئے کہ بتائیے میں کون سا اسلام قبول کروں قبول کروں؟ بات تلخ تھی لیکن حقیقت واقعہ منت چشمہ صافی کتاب وسنت سے اس کی عقل و دماغ اور دل کے تاروں کو چھیڑنے وہ باسانی سمجھ سکیں کہ یہ خود ان کی اپنی بنیادی یہی ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے دل پر پتھر بندی کا مظاہرہ کرتا ہے اور بزعم خود اپنے آپ اس تک بھی ٹھیک اور گوارہ ہے لیکن دوسروں کو یہی فقہ کی بنیادی اور کلیدی کتابوں کے متعلق حق اجازت دیتا ہے اور یہ کہاں کی دینداری ان کو بیان کرنے اور واضح کرنے کے لئے بلن ان کو سمجھے بغیر محض اردو کی چند ایک کتابیں رنا اور انہیں ورغلانا ہی اس طبقہ کے نزدیک یہ کردار کتاب وسنت سے قطعی میل نہیں کھاتا پیدا کرتا ہے جس سے متلاشی حق میں بدمزگی مسلک کی دعوت کو اولیت کا درجہ دینے سے تے ہیں۔ آپ عقائد اور مبادیات سے اسے سبکی طریقہ پر لحاظ رکھئے تو انشاء اللہ متلاشیان

سخت ہونا، اس راہ میں قدم قدم بلاؤں کا پایا جانا اور مواقع و مشکلات کا ہونا۔ یہ سوچ پست ہمتی کی سوچ ہے، تن آسانی کی سوچ ہے اور فریضہ کی ادائیگی سے راہ فرار کی کوشش ہے ورنہ عوامی سطح پر پیاس اور طلب ہے اور حق بات کو قبول کرنے کا مزاج بھی ہے۔

ہاں مسئلہ ان نو واردوں کی تربیت کا بھی ہے، چند ادارے اپنے ٹھوس ارادوں اور اللہ کی توفیق کے بل بوتے اور اسی کے سہارے پر یہ کام بھی کر رہے ہیں، جماعتیں بھی انہیں کچھ سہارا اور تقویت پہنچاتی رہتی ہے لیکن مسائل اور بھی ہیں اور یہ مسائل باسانی حل ہو جائیں اگر مسلمان سچی اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر کلمہ طیبہ کی بنیاد پر ذات پات، رنگ و نسل جیسے غیر اسلامی رسوم کو اپنے یہاں سے در بدر کر دیں مشکل یہ ہیکہ علی العموم ہم مسلمانوں نے اپنے ہمسایوں پر اثر مرتب کرنے کے بجائے اثر قبول کیا ہے ذات برادری کے بکھیڑے اس کی ایک مثال ہیں۔

مذکورہ بالا سطوریں چند افکار پریشاں پر مبنی ہیں اور ان علماء کرام کو اس مضمون کے ذریعہ دعوت فکر دینا ہے جو مستند علماء کرام ہیں اور شریعت مطہرہ کی جزئیات پر جن کی نگاہ ہے، اصل فیصلہ، فکر اور رہنمائی تو ان ہی کا حصہ ہے۔

اس لحاظ سے ممتاز و موثر ہے کہ نے اپنے لئے جو میدان کار چنا ہے وہ زمینی طور سے قلب میں سوز و گداز اور خشیت پیدا ہوں کو ہموار کرتا ہے۔ اور اللہ کے بندوں کو اس کام کی نوعیت اور طریقہ کار کی محدودیت اور ایک مخصوص طرز پر اور یکسانیت کے ساتھ صلاح امت کا کام ہے اور اس امت کو جس تقاضے ظاہر ہے کہ پورے نہیں ہوتے۔ لیکن امت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ رہی دوسری بین کا کام ہے اور وہ اپنے اپنے نیچ پر اس کام خصوصاً علاقائی زبانوں میں قرآن پاک کے معنی و تقاضا کو برادران وطن سے رابطہ، محاسن کے گھیرے سے نکالنے کے لئے کتابوں کی ہیں جنہیں نظر انداز کرنا ستم ظریفی کی بات ہو اول بن سکے البتہ جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ

پڑھا لکھا یا دانشور طبقہ ہے، جس طرح تبلیغی ہے، اس طرح عوامی سطح پر دعوت دین کا کام اس قدر فطری سادہ و دلکش ہیں کہ اس کو سمجھنے کی نہیں، ایک عام فہم اور سیدھا سا پیغام ہے جو آلائشوں سے عاجز دنیا دلی سکون کی واقعی ت میں باسانی مل سکتا ہے۔ دلوں کی زمین کا

نفسی کے طفیل اس ”نعمت“ کا تسلسل اب تک قائم ہے۔ اس دور کے ان علمائے ربانین کی مدارس کے تئیں درد مندی و فکر مندی اور دلسوزی و قربانی کے واقعات پڑھئے اور اس راہ میں رکاوٹوں اور دشواریوں کا حال جانئے تو اگر ہمارے سینوں میں پتھر نہیں، دل ہے تو وہ یقیناً بھرائیں گے..... ع

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کیا یہ صحیح نہیں کہ ان دنوں چند لوگوں کی بدولت کچھ مدارس ”مشن“ نہیں بلکہ ”تجارت“ کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ اور تجارت ہی کی وہ ذہنیت ہے جو ”سو بھیس بنالیتی“ ہے..... مثلاً فرضی مدارس! مکتب کو مدرسہ قرار دینا! مدرسہ کو جامعہ کا نام دے دینا! اور مسکین صورت بن کر مدرسہ کے طلبہ کی غریبی و ناداری، یتیمی و مفلسی کی ایسی دردناک تصویر پیش کرنا کہ سننے والا سنئے تو اس کی آنکھیں بھرائیں اور اس کا دل موم ہو جائے..... لیکن افسوس کہ عموماً اس فرضی پیتا سنانے والے کی نگاہ سننے والے کی جیب پر ہو! خدا مجھے معاف کرے، میں خود مدرسے کا نمک خوار اور اس کا ایک معمولی خدمت گزار ہوں۔ مدارس کی بے سروسامانی اور کمپرسی، ان کے مسائل اور ان کی دشواریوں سے ہرگز ہرگز انکار نہیں اور مدارس میں بڑی تعداد میں الحمد للہ مخلصوں کی آج بھی کمی نہیں لیکن اعتراض ہے تو ان لوگوں پر جو اس صورت حال کا ”استحصال“ اپنے ”ذاتی مفاد“ کے لئے کرتے ہیں..... ایسے لوگوں سے میرا ایک سوال ہے کہ تم اپنے مقاصد کی برآوری کے لئے مہمانان رسول کی اور مدارس کی کس قدر بھونڈی تصویر پیش کرتے ہو اور سچ بتاؤ اگر برا نہ مانو کہ مدارس کے نام پر اس ”تجارت“ نے تمہارے اپنے معیار زندگی کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے؟! اس کے علاوہ یہ بھی بتاؤ کہ تم ان مدارس کی کیا تصویر پیش کر رہے ہو جس کی اہمیت و افادیت کا ادراک و شعور تمہارے ان دشمنوں کو بھی ہے جن کو تمہارے وجود ہی سے دشمنی ہے..... اور اس دور انحطاط میں بھی جن مدارس کی تعلیم و تربیت کے قائل وہ حضرات بھی ہیں جو عصری دانش گاہوں میں اپنی عمریں کھپا چکے ہیں..... اپنے اسلاف سے سبق حاصل کرو، دور نہ جاؤ

خیر کے سرچشمے ہیں

سچ ہے اور سچ تلخ ہوتا ہے..... لیکن اطمینان اللہ مدارس کے خیراتی ادارے ہونے کا تصور بات امیر شریعت حضرت مولانا نظام الدین ”نئی“ میں گزری ہے..... میں سوچتا ہوں کہ ام اسلام کی مایہ ناز درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دیگر درس گاہیں کس کمپرسی، اور عالم بے لکھنؤ اور اولوالعزم ربانی علمائے کرام نے کیسا پاکیزہ جذبہ، کس قدر سچی تڑپ، اور کیسی بلکہ گوشہ سے اس قدر اپنائیت و تعلق کا جذبہ کر دہ مدارس سے بلکہ سارے ہی مدارس سے فوٹوں کے وجود و بقاء کا مسئلہ تھا، ان کے (مڑتے ہوئے قدموں کو جمانا مقصود تھا، اسلام زمانہ ایثار و بے نفسی کا تھا۔ ہم تک صحابہ کرام پہونچی، اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اسی کے ان بے لوث و مخلص بانیوں کی ایثار و بے

صومولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو دیکھو کہ مال و زر  
اور ع ”جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن“ کی کیسی  
روں مخلصین پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہے جو آج  
ہے ہیں۔

مدارس ”تحفظ“ کے ساتھ

”خود احتسابی“ کو بھی نظر انداز نہ کریں!

گستاخی معاف! راقم آثم ایسی رجائیت پسندی کا قائل نہیں کہ حقیقت کو چھپانے  
کے لئے غلط بیانی کا سہارا لینا پڑے اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہا جائے کہ ہم تو یاس  
و ناامیدی سے دور ہیں ایک نہیں ہزار بار اعتراف کہ مدارس اغیار کے نشانے پر ہیں اور ان  
پر جھوٹے، بے بنیاد الزامات و اتہامات عائد کرنے کی منصوبہ بند سازشیں ہو رہی ہیں، اس کا  
بھی نہ صرف اعتراف بلکہ پورا ادراک و شعور اور احساس کہ عامۃ المسلمین کی نظروں میں  
طبقہ علماء کے وقار و اعتماد کو مجروح کرنے کی بڑے دور رس نتائج کے پیش نظر ریشہ دوانیاں کی  
جاری ہیں اس لئے کہ غیروں کے سامنے حال کی نہ سہی البتہ ماضی کی مثالیں ہیں اور وہ اس  
حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ امت مسلمہ کی لگام اور باگ ڈور ہمیشہ سے طبقہ علماء کے  
ہاتھوں میں رہی، بلاشبہ وہ قطب نما رہے اور نہ صرف مسلمانوں کے حق میں بلکہ بنی نوع  
انسان کے حق میں بھی! انہوں نے اپنے اخلاق و کردار سے زمین کی سی وسعت، آسمان کی  
سی بلندی اور سمندر کی سی گہرائی کا مظاہرہ کیا چنانچہ ان علمائے ربانین کی اخلاص مندی، درد  
سوزی و جگر کاوی نے تاریخ کے دھاروں کو موڑ دیا اور تاریخ و جغرافیہ کی دنیا میں بغیر شور  
شرابے اور ہنگامہ آرائی کے وہ انقلاب برپا کیا کہ صدیاں ان کی مرہون منت رہیں، حضرت  
مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس کی روشن مثالیں ہیں۔

اس کے وجود کو سرتا پارحمت سمجھتے تھے لیکن افسوس کہ ان دنوں علی العموم وہ کیفیت جاتی رہی اور اب کمیت (Quantity) کی یہ دین ہے کہ اگرچہ علماء کی کھیپ کی کھیپ ہر سال فارغ ہو رہی ہے لیکن دینی و دعوتی دلی تقاضوں کے محاذ افراد کار کے لئے ترس رہے ہیں۔

ماضی میں مدارس میں استاذ و شاگرد کے مابین رشتہ بڑا مقدس و محترم اور مستحکم ہوتا تھا اکبرالہ آبادی نے تو اپنے دور کے انگریزی خوانوں پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ استاذ کی خدمت میں ہدیہ دل پیش کرنے کے بجائے بل پیش کرتے ہیں لیکن مدارس میں اس وقت کی صورت حال نہ تو ہدیہ دل کی ہے نہ بل کی، بلکہ استاذ تو اسی میں خیر منائیں کہ طلبہ بس انہیں برا بھلا نہ کہیں، ان کی عیب چینی نہ کریں اور ان کے لئے ضرر کا باعث نہ بنیں، مشہور قصہ ہے کہ ایک بزرگ استاذ راستہ سے گزر رہے تھے اور ایک کتا بھونکتا چلا جا رہا تھا، انہوں نے مڑ کر کتے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! تم کیوں خفا ہو، میں نے تمہیں پڑھانے کا جرم تو کیا نہیں ہے!!

اس کا اعتراف نہ کرنا دیانت کے خلاف ہوگا کہ مدارس جزیرہ نہیں ہیں، یونیورسٹیوں میں یونین الیکشن کے نام پر جس طوفان بدتمیزی کی خبریں ہیں اور وہاں کا جو عمومی ماحول ہے اس کی مسموم فضا سے دانستہ یا نادانستہ مدارس کے طلبہ بھی متاثر ہو رہے ہیں جن دنوں دارالعلوم دیوبند کا قضیہ نامرضیہ پیش آیا تھا، مجھے یاد آتا ہے کہ ان ہی دنوں میں مسجد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نے ایک تقریر فرمائی، عالمی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے طلبہ کو ان کا مقام یاد دلایا تھا اور اسی ضمن میں اقبال کے درج ذیل شعر کو پڑھا تھا لیکن اس سے قبل یہ بھی فرمایا تھا کہ اب تو اس شعر کو پڑھتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا ہے کہ نہ معلوم آپ کس قسم کا طوفان مراد لیں، شعر یہ تھا

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ماضی کے مدارس کے استاذ اور شاگردوں کے مابین مقدس رشتوں کے موضوع پر کوئی مستقل کام کرنا چاہے تو یقیناً وہ یہ ثابت کر سکے گا کہ یہ رشتہ کس قدر پاکیزہ اور باہمی

حال کا بھی جائزہ لے لیجئے، ہمیشہ سے یہ بھی پس رہا، اغیار نے کمال عیاری سے آج مدارس سے زیادہ خطرے اور اندیشے کی بات مدارس بنیادی وجہ یہ ہے کہ عموماً لا ماشاء اللہ مدارس میں نہیں دکھائی پڑتا بلکہ اپنے مسلک و مشرب کے بابا ہے، بات تلخ ہے لیکن سچ ہے کہ مدارس کے مدارس کی خوشنودی کے لئے ان کی زبانیں نہ تے رہیں، اغیار اصل تیشہ تو اسلام پر چلا رہے اس قدر بند ہیں کہ انہیں اس کا شعور و احساس نی کو ہی وہ خدمت دین سمجھ رہے ہیں۔

ک صورت حال یہ پیدا ہوئی ہے کہ عملاً مدارس بیوں مثالیں ماضی قریب ہی کی موجود ہیں کہ عزت و آبرو کا تھا اور شریعت مطہرہ کا تھا لیکن بنیاد چپقلشوں کا کہ ایسے نازک موقعوں پر بھی اور ایک دوسرے کے کیس کو کمزور کرنے میں

لان ملت کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنا ہوتا ہے فسانہ معلوم ہوتا ہے جب علم دین کا ایک ایک یکسر مجسم ہوا کرتا تھا چنانچہ اس نسل میں ڈھل ٹٹی پر کھرا اترتا تھا اس وقت ”کیفیت“ ایک جماعت کا کام کر دکھاتا تھا اور افراد علاقے کے علاقے اس سے فیض اٹھاتے اور

میں نہیں بھول پاتا جب وہ مدارس کی نافعیت کو بیان کرتے ہوئے امت کے لئے مدارس کے وجود کو ناگزیر بتا رہے تھے اور مدارس و ملت کے وجود کے چولی دامن کا ساتھ ثابت کرتے ہوئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نا انصافی و ستم ظریفی کی بات ہوگی کہ کشتی کے اندر اگر طوفان ہو تو وہ موج بلا سے گذر کر ساحل تک کیوں کر پہنچ سکتی ہے؟ ایک طرف تو یہ صورت حال ہے کہ ”نیو ورلڈ آرڈر“ قائم کرنے کے خواہاں باریک بینی سے مدارس کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور یہاں نوبت یہ ہے کہ نہایت چھوٹی اور بھونڈی مصلحتوں کی خاطر مدارس کے عظیم مقاصد مثلاً طلبہ میں رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین، کارکنوں کے مابین سچے رشتہ، اخوت و بھائی چارگی کے پروان چڑھنے، معلم و مربی کا استحقاق رکھنے والوں کو نہ کہ مقررین کو اس ذمہ داری کی تفویض، مدارس کے کارکنوں کے دلوں کو جیتنے کا حوصلہ نہ ہو تو کم از کم ان کا دل دکھانے سے گریز، نفسیاتی اصولوں کی رعایت کے ساتھ تربیت کا واقعی نظم اور قیام مدرسہ کے اولین مقصد طلبہ کی تعلیمی صلاحیت کے لئے دردمندی کے ساتھ تدابیر کے اختیار کرنے جیسے بنیادی امور سے غیر شعوری طور پر ہی سہی، صرف نظر کیا جا رہا ہے، کھا دو فراہم کی جا رہی ہے جس سے بظاہر تو پھول کھلیں لیکن ایسے پھول جو خوشبو سے خالی ہوں، نفع سے عاری ہوں اور نتیجہ میں کوئی گلچیں نہ معلوم کب شاخ سے انہیں توڑ کر کے اپنے مقصد کے لئے باسانی استعمال کر لے اور برسوں کی محنت اکارت چلی جائے۔ الا مان والحفیظ

زندہ تو میں احتساب سے کبھی خوف نہیں کھاتیں، بلکہ جائزہ کو وہ ترقی کے لئے ناگزیر سمجھتی ہیں، وہ ماضی کی داستانوں میں نہیں جھپٹیں بلکہ زمانہ حال کی رفتار اور اس کی نبض پر اس کی انگلیاں رہتی ہیں اور یہی وہ بیدار مغزو و حوصلہ مند قومیں ہوتی ہیں کہ دنیا کے مستقبل کا نقشہ ان کی قوت ارادی کے نشانہ پر ہوتا ہے۔

اس دور انحطاط میں بھی مدارس کی اہمیت و افادیت اور ان کی نافعیت سے حاشا و کلا ہرگز ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مدارس کے امت سے رشتہ کے خدا نخواستہ منقطع

تھی جس نے مدارس کی خاک سے انسان کے ساتھ افراد سازی کے وہ کارنامے انجام دیے ہیں جن کی مثال دی جاسکتی ہے ہکشاں چھوڑ گئی جن کی آب و تاب ان کے علم کا رشتہ تھا، دین کا رشتہ تھا، اخلاص کا رشتہ دین و شریعت اور اخلاص و عمل کی پیکر تھیں، ان رکنوں کی باتیں تو نہایت زور و شور سے کی گئیں سلسلہ بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ جاری رہتا رہا مگر مقصود و مطلوب سر بلندی اسلام ہے تو ایسی باتیں ہیں اور حضرت بلال حبشیؓ بھی!! یہاں

رہے۔ رزق کی بلندی کا کام کرنے والے کر گئے، مل علماء ربانین (ان کا ربانی ہونا شرط ہے) نام اس لئے بھی ان شاء اللہ جاری رہے گا کہ بابتہ دکھ اس بات کا ہے کہ ان دنوں اس کام کی لئے دور دراز نے بہت مضمحل کر رکھا ہے، دینی امور ناقص ہے۔

ست نہیں بات اساتذہ و طلبہ کے مابین پاکیزہ مدارس ربانی اور خدا ترس علماء سے خالی نہیں ڈے ہونے جیسے بے بنیاد الزامات عائد کئے بی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی کی وہ مجلس

## صرف نصاب تعلیم ہی کا نہیں نظام کا بھی جائزہ لیجئے

مدارس کے نصاب تعلیم کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا رہا ہے۔ یہ بات زندگی کی علامت ہے اور گواہی دیتی ہے کہ الحمد للہ دینی تعلیم سے وابستہ سرکردہ شخصیات اس طرف سے غافل نہیں ہیں وقت کی نبض پر ان کی انگلیاں ہیں، عصری تقاضوں پر وہ نگاہ رکھتے ہیں اور دینی تعلیم کے سرچشموں یعنی مدارس کی افادیت و نافعیت کو مفید سے مفید تر بنانے کی کڑھن انہیں نصیب ہے۔ مدارس کے نصاب تعلیم کے مسئلہ پر وقتاً فوقتاً غور و فکر کئے جانے کا عمل جس قدر ضروری ہے اتنا ہی نازک اور حساس بھی ہے، اس لئے کہ نصاب تعلیم کے متعین کئے جانے کے اثرات کسی بھی ادارہ کے رخ، مزاج، طرز فکر اور طرز عمل سب پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کی پالیسی سازی محض پالیسی سازی تک محدود نہیں رہتی بلکہ اسی پر شخصیت سازی اور ذہن سازی کا دار و مدار ہوتا ہے، نصاب سازی کا کام نئی نسل کے مستقبل کے اچھے یا برے، روشن یا تاریک، یقینی یا غیر یقینی ہونے کے لئے رہنما خطوط فراہم کرنے کا کام ہے اس لحاظ سے اس سلسلہ کا ایک صحیح فیصلہ نئی نسل کے لئے ان کے مستقبل اور ان کی مقصدیت کو صحیح سمت عطا کر دینا ہوتا ہے ذرا سی چوک یا غلطی کی وجہ سے خدا نخواستہ فیصلہ اس مصرعہ کے مصداق بھی ہو سکتا ہے کہ

لحوظ نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اس دور میں نصاب تعلیم پر غور و فکر کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ گئی ہے کہ اب یہ

کے دین سے رشتہ کا کمزور پڑ جانا ہے مدارس  
آزما مرحلوں، انتظامیہ کے شکنجوں اور معاشی  
عت دین میں لگے ہیں، اللہ ہی ان کو اس کا  
مدعا صرف اتنا ہے کہ اغیار کے حملوں سے  
س زیادہ ناگزیر خود احتسابی کا کام ہے اندرونی  
وشن ماضی کی تاریخ کا ایک بار پھر دہرایلنا، نیز

نظام اگر مصلحتوں اور اندیشہ دور دراز سے اوپر  
بلندی کے لئے درست کر لیا تو نئی نسل نہ صرف  
ملت کے مقدر کا ستارہ ثابت ہوگا۔ اور راہ بھٹکے  
ریضہ انجام دے سکے گا بشرطیکہ ارباب مدارس  
نوقتیت دیتے ہوئے اس کی سر بلندی کے لئے  
اللہ کی حمایت و نصرت اسی صورت میں آسکتی  
اصد و نصب العین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے  
ص مندی کے ساتھ دور کرنے پر توجہ دیں اور  
بہی حامی و ناصر ہے۔



## مسلمانوں کو جدید تعلیم اپنانے کی ضرورت

سچر کمیٹی نے ہم مسلمانوں کو آئینہ دکھایا ہے سماجی اقتصادی و تعلیمی اعتبار سے ہم کہاں کھڑے ہیں۔ سچر کمیٹی نے صرف مرض کی تشخیص کی ہے علاج ہمیں خود تجویز کرنا چاہئے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تعلیم قوموں کی ترقی کے لئے نسخہ کیمیا ہے اور ان دنوں تو اطلاعی انقلاب و انفارمیشن ٹکنالوجی کی وجہ سے انفجار اور Explosion کی کیفیت تعلیمی دنیا میں بھی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ اسے اپنا رہا ہے اور ایک ایسا سماج تشکیل پا رہا ہے جس کو Society Knowledge-based کہا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں تعلیم اور علم نے ایک بین الاقوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے تاکہ علم سب کے لئے ہو Unicef بھی اسے تحریک کی شکل میں عام کر رہی ہے اور ہمارے ملک میں سکچھا ابھیان (تعلیمی مہم) کے ذریعہ اس تحریک کو آگے بڑھایا جا رہا ہے علاوہ ازیں، تعلیم کی تحصیل کی عمر ان دنوں بیس پچیس برس کی عمر تک محدود نہیں رہ گئی بلکہ Life Long Learning کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔

حاصل یہ کہ حصول تعلیم کا ایک طریقہ تو روایتی طریقہ تعلیم کا ہے ہی اس کے علاوہ Distance Education (فاصلاتی طریقہ تعلیم) اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں کمپیوٹر و انٹرنیٹ کے ذریعہ On Line Education کا طریقہ تعلیم بھی رواج پا گیا ہے۔ اس تناظر میں ہمیں اس کا جائزہ لینا چاہئے کہ ان جدید طریقہ ہائے تعلیم سے ہم مسلمان کس حد تک استفادہ کر رہے ہیں نیز بر سبیل تذکرہ خصوصیت کے ساتھ اس بات کا

ایک عرصہ سے دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے اور تے رہتے ہیں۔ Moderate Islam یعنی یوں چالوں میں سے ایک خوشنما چال ہے، یہ فکر موثر ہونے پر نقب زنی لگانے کے مترادف ہے انڈیشوں پر علماء و دانشوروں کی رائے بھی

عربہ کی خدمات کے عوض معاشرہ پر عملی و فکری ت کا ادراک و شعور اغیار کو آخر ہمارے مقابلہ کی فکر کیوں ستاتی ہے؟

انہیں بلکہ درد مند ان ملت کا فرض بنتا ہے کہ وہ لئے پیش بندیاں کریں بلکہ سارے تحفظات کا حقیقت پسندانہ جائزہ بھی لیتے رہیں۔ خوبصورت خاکہ اور نقشہ تو بنایا جاسکتا ہے لیکن ہے، افسوس کہ ان دنوں تربیت اور رجال سازی مدارس عربیہ کا طرہ امتیاز تھا، جس سے باطل خصوصیت کی بدولت تہ و بالا ہو جاتے تھے، اس نے کی ضرورت ہے اور یہ وجوہات مدارس کے تہ ہیں ان دنوں ارباب مدارس کے لئے کرنے کا بھی جائزہ لیں کہ نظام کی ابتری بہتر سے بہتر کی طرف ایک مرد دانانے اس طرح متوجہ بن تعلیم کچی ہوتی جا رہی ہے۔

زانوئے تلمذ تہہ کرنے کے نتیجہ میں ایسا استاذ اپنی فکر اور اپنے عمل دونوں سے اپنے شاگردوں کو متاثر کرتا ہے لیکن مذکورہ بالا طریقہ ہائے تعلیم سے بھی موجودہ حالات اور ان کے تقاضوں سے صرف نظر کرنا اپنا نقصان آپ کرنا ہوگا۔

سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آٹھ ارب کی آبادی کو خواندہ بنانے کے لئے کیا ہمارے پاس کوئی انفراسٹرکچر ہے؟ ظاہر ہے کہ ہمارا جواب نہیں میں ہے ایک اور بات ہے جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ فاصلاتی طریقہ تعلیم اور On Line Education طریقہ میں یہ فرق ہے کہ فاصلاتی طریقہ تعلیم میں تو یہ ہے کہ مضامین پر مواد ارسال کر دیا گیا جسے پڑھ کر طالب علم نے امتحان دے دیا لیکن انفارمیشن ٹکنالوجی کی بدولت جو انقلاب آئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سی ڈی، ویڈیو اور آڈیو پروگرامنگ کے ایسے پروگرام متعارف کرائے گئے ہیں کہ جن میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ استاذ سامنے موجود ہے اور وہ طلبہ کو پڑھا رہا ہے اس میں بھی دو شکلیں ہیں ایک تو یہ کہ بنا بنایا پروگرام سی ڈی کے ذریعہ نشر کیا جاسکتا ہے اور جس میں استاذ کا انداز تکلم و تفہیم، لب و لہجہ، نشیب و فراز اور حرکات و سکنات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اسکرین پر دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے طریقہ تعلیم کی ایک شکل اور بھی ہے۔ جس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ Ignou کے صدر دفتر سے یا اس کے کسی اسٹڈی سنٹر سے کسی فن کا ایک ماہر استاذ کسی موضوع پر لیکچر دے رہا ہے۔ یہ پروگرام نشر ہو رہا ہے اور دنیا بھر میں ناظرین اسے دیکھ رہے ہیں لیکن یہ پروگرام انٹرایکٹیو پروگرام ہے یعنی فرض کیجئے کہ پروگرام کلکتہ سے نشر ہو رہا ہے لیکن ایک خاص سسٹم کی وجہ سے کشمیر میں بیٹھ کر سننے والا طالب علم اگر چاہے تو وہیں سے سوال کر سکتا ہے اور لکچر اسے سنتا اور جواب دیتا ہے اس صورت میں استاذ اور شاگرد دروہر دور ہم کلام ہوتے نظر آتے ہیں۔

ان دنوں میدان تعلیم میں ہم مسلمان جہاں کھڑے ہیں اور جس تعلیمی پس ماندگی

کو دفاعی پوزیشن میں کھڑا کر دیا گیا ہے اور م کی اصل تصویر دیکھنا اور سمجھنا چاہتی ہے اس کی ہو اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی بدولت دنیا کی ہے کہ وقت کے تقاضے اور جدید دور میں ہوئے مسئلہ کا مثبت حل نکالا جائے۔

نی نیشنل اوپن یونیورسٹی (Ignou) کے چھ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جی ممالک میں بھی اس کے اسٹڈی سنٹرز ہیں، بیا ۲۰-۲۵ لاکھ طلبہ استفادہ کر رہے ہیں اور بھی جاتی ہے۔ کمپیوٹر، مینجمنٹ اور اسی طرح بنادیا ہے۔

میں اس طریقہ تعلیم سے استفادہ کی، لیکن جیسا لئے بھی اور متلاشیان حق کے لئے بھی فاصلاتی ذریعہ دین حق کی باتیں بھی عام کی جائیں۔ جی میں سٹیلاٹ کے ذریعہ علوم و فنون کی نتیجہ میں عالم گیر سطح پر تعلیم کی ترویج و اشاعت تعلیمات کی ترسیل کے لئے ان جدید طریقہ کر بیٹھنا چاہئے کہ عملی اور تکنیکی لحاظ سے ایسے

کہ علوم شرعیہ یا عصری تعلیم و ترسیل کے لئے On سسٹم اپنانے کی صورت میں طلبہ کی صاحب کردار اور ذی علم استاذ کے سامنے

## اربابِ مدارس کی خدمت میں ایک عاجزانہ درخواست

مدارس کے امتحانات سالانہ ختم ہوا چاہتے ہیں ماشاء اللہ مدارس سے سینکڑوں کی نہیں ہزاروں کی تعداد میں علماء فارغ ہو کر اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں گے لیکن میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہزاروں کی تعداد میں ہر سال فارغ ہونے والے یہ علماء آخر جاتے کہاں ہیں؟ اور معاشرہ پر ان کے مثبت اور تعمیری اثرات آخر کیوں نہیں مرتب ہوتے دکھائی دیتے اصلاح معاشرہ کا بڑا شور و غوغا ہے لیکن کام کی رفتار اور اس کے اثرات سے سب واقف ہیں علاوہ ازیں، دین کے تقاضے پکار پکار کر دین کے علمبرداروں سے بہت کچھ کہہ رہے ہیں اگر فارغین مدارس کو ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر اور دین کے تقاضوں کے مد نظر صحیح سمت دے دی جائے تو دینی تقاضوں کے لحاظ سے بہت سے مفید اور ناگزیر کام انجام پذیر ہو سکتے ہیں مثلاً

☆ دعوتِ دین کے لئے داعیوں کی تیاری کا مسئلہ ہے اسلام سے متعلق پھیلائی جارہی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کے حامل متکلمین کی تیاری کا مسئلہ ہے۔

☆ مدارس میں اہل و لائق مدرسین اور مربیوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔  
☆ صحافت کے میدان میں اسلامی ذہن رکھنے والے صحافیوں کی تیاری کا مسئلہ ہے۔  
☆ عربی و انگریزی اور دیگر زبانوں میں حالاتِ حاضرہ کے پیش نظر اسلامی

لئے ضرورت اور تقاضہ اس بات کا ہے کہ  
ریشن تکنالوجی کے نتیجہ میں حصولِ تعلیم کے جو  
دہ میں ہم دیر نہ کریں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں  
کرتا نہ چلنے والوں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے حکومتوں  
فرض کی ادائیگی میں کوتاہی بھی جرم ہے۔ خدا  
بھائے تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھایا تو ہمارے

طرزِ کہن پہ اڑنا  
مومنوں کی زندگی میں

کی تیاری کا مسئلہ ہے جو بیک وقت عربی اور اسلامی نقطہ نظر کو پیش کرنے کی قدرت

## طلباء میں بے مقصدیت کا ذمہ دار کون؟

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے کارخانے میں کوئی چیز عبث و بے کار نہیں بنائی، اسی نکتہ کو اقبال نے اپنی ایک نظم میں گلہری کی زبان سے یوں کہلوا دیا ہے

نہیں کوئی چیز غم کی قدرت کے کارخانے میں

اس نظم میں بات گلہری اور پہاڑ کی ہے، پہاڑ کا ثبات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے، لیکن گلہری کی چلت پھرت بھی اپنی جگہ ایک واقعہ! یہ نکتہ بتاتا ہے کہ رب کریم نے جب دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں کو بھی نافع اور مفید بنایا ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے، اسے بغیر کسی صلاحیت اور جوہر کے پیدا کر دیتا! بائبل کی ایک مشہور کہانی ہے کہ ایک شخص نے سفر پر روانہ ہوتے وقت اپنے تین خادموں میں سے دو کو دودا اور ایک کو ایک سکہ دیا، اول الذکر دو اشخاص نے تو اس کے دئے ہوئے سکوں کو استعمال کیا اور اس طرح ان کے مال میں اضافہ ہوا، لیکن آخر الذکر نے اس سکہ کو مقدس مانتے ہوئے ایک امانت کے طور پر زمین میں دفن کر دیا، جب وہ شخص جس نے ان تینوں کو یہ سکے دئے تھے واپس لوٹا، تو اس نے ان سکوں کے متعلق ان متعلقہ افراد سے پوچھ گچھ کی، سب نے اپنا اپنا حال بیان کیا، اول الذکر دو سے تو وہ بہت خوش ہوا کہ انہوں نے اس کے دئے ہوئے سکوں کو استعمال کیا اور استعمال کرنے کے نتیجہ میں نفع اٹھایا، لیکن آخر الذکر سے سخت ناراض ہوا کہ اس نے اس کے دئے ہوئے سکے کو زمین میں دفن کر دیا، اگرچہ اس عمل کے پس پشت بظاہر ایک نیک جذبہ کار فرما تھا مگر عمل کی دنیا میں اس کا یہ کام خود فریبی کا عمل تھا، اور سکہ کو کام میں نہ لاکر اس نے خود اپنے اوپر فوائد کے دروازے بند کر لئے۔

لئے اچھے قاضیوں کی تیاری کا مسئلہ ہے۔

مزاج کو اب بھی شرمندہ تعبیر ہونا باقی ہے۔

س اور ناگزیر کاموں کے سلسلہ میں ”خانہ پری

بزرگوں کو ششیں نہ ہونے کی وجہ سے فارغین مدارس

فت کے بعد اب وہ کدھر جائیں؟ مدارس کا

ادیتے ہیں ہمارا مدعا تو بس صرف اتنا ہے کہ وہ

ست و خدمت کے بھرپور اعتراف کے ساتھ

ہمارے طلبہ کیلئے دین کے تقاضوں اور ان کی

زیں، اور ان کے کام کا رخ متعین کر دیں سال

بہ اور خود مدارس کی برسوں کی محنت ٹھکانے لگے

نوں کا رخ پھیر دیتے ہیں۔ فہل من مدکر!

آج ہمیں اپنے طلبہ میں بے مقصدیت کے پائے جانے کا شکوہ تو ہے لیکن خود اساتذہ اور والدین میں اپنی اس غلطی کا احساس یا اعتراف کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے، کہ بچے میں وہ صلاحیت جسے God Gifted یا خدائی عطیہ کہا جاتا ہے ان کا ادراک کرنے یا اس کو پروان چڑھانے کی طرف سے وہ بے توجہی اور غفلت برتتے ہیں، نتیجہ میں قدرت نے بچہ میں جس جوہر کا بیج رکھا تھا اسے کھاد نہ ملنے کے سبب وہ رائیگاں چلا جاتا ہے، اس صورت حال میں یہ کہنا بیجا نہیں کہ ہم اساتذہ طلباء کو الزام دیتے ہیں، جبکہ قصور خود ہمارا ہے یا یوں کہئے کہ اس اہتر صورت حال کی ذمہ داری میں طلبہ کا قصور کم اور اساتذہ کا قصور زیادہ ہے۔

طلبہ میں تعلیم کی طرف سے بے توجہی کی ایک اور وجہ ابتدائی مرحلہ میں طلباء کو وہ تعلیمی غذا فراہم نہ کرنے کی ہے جو اس مرحلہ میں ان کے لئے ضروری اور ناگزیر ہوتی ہے، مثلاً عربی مدارس کے طلباء ہی کو لیجئے اگر ابتدائی مرحلے میں انہیں عربی زبان نہ سکھائی گئی، زبان کے اصول و قواعد نہ سکھائے گئے، عبارت خوانی کے بنیادی اصول نہ بتائے گئے اور طرہ یہ کہ انہیں سال بہ سال امتحان میں بھی کامیاب کیا جاتا رہا، تو پھر اس دشواری کا پیدا ہونا لازمی ہے کہ ایسے طلباء کی تعلیمی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا ضرور آئے گا کہ جب ان کا دل اونچی درسی کتابوں میں نہ لگے، استاذ ایک وادی میں ہو اور شاگرد کسی دوسری میں، جب کسی بچہ کو زبان ہی نہ سکھائی گئی ہو اور ایسے بچے سے یہ شکوہ کہ یہ اس زبان کے ادب سے دلچسپی نہیں رکھتا، نہ صرف یہ کہ بے جا ہے بلکہ ایک طرح کا ظلم ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ طلباء کی تعلیم کی طرف سے بددلی میں قصور ان طلباء کا ہے یا ابتدائی مرحلوں کے ان اساتذہ کا جنہوں نے ان طلباء کو صرف ونحو، انشاء و عبارت خوانی جیسے لازمی مراحل کی ہوا بھی لگنے نہ دی، تعلیم کی طرف سے غفلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اساتذہ اور نگران حضرات کی تقرری میں صلاحیت کے بجائے تقرب کا عمل دخل ہے، آج بنیادی مطلوبہ صلاحیت ”مفروضہ وفاداری“ ہے، وفاداری تو محض ایک حسین عنوان ہے مگر اس کے پس پشت اپنی خوشامد پسندانہ طبیعت کو تسکین پہنچانا ہے، ورنہ سچی وفاداری سے کسے انکار ہے،

جوہر کے مثل قرار دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اندر کوئی نہ کوئی جوہر اور کچھ نہ کچھ صلاحیت قدرت کی اس دی ہوئی صلاحیت کو استعمال با تو وہ غلطی ایسی ہی غلطی ہوگی جو مذکورہ کہانی میں وجہ سے وہ اپنے مالک کے غیض و غضب کا کا ایک بیج رکھ دیا ہے، اب یہ انسان پر موقوف میں لائے اور اس بیج میں برگ و بار لانے ہم کرنا محنت، عمل اور فکر چاہتا ہے اگر انسان گے گا اور اس نعمت کی قدر و قیمت سمجھے گا تو اس کو نکھارا جائے، تاکہ یہ بیج نہ صرف یہ کہ تناور یہ کہ وہ خود فائدہ اٹھائے بلکہ اس کی صلاحیت

س، اسکولز اور ان میں زیر تعلیم بچوں کی صورت میں، مارا المیہ یہ ہے کہ علی العموم ہمارے اساتذہ، فکر و مندی دکھائی نہیں دیتی، اور مطلوبہ فکر و مندی زیر تربیت بچوں کے اندر خدا کی طرف سے، یا اگر انہیں ان میں موجودہ جوہر کا احساس و خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے، تو اس جوہر تے، یہ بات ہم صرف اساتذہ اور والدین کے بچے ہوتے ہیں اور بچپن کے مرحلے میں انہیں جیسے ہو سکتا ہے؟ اس لئے ذمہ داری بہر حال وہی نئی نسل کے معمار ہوا کرتے ہیں۔

اکثر فارغین مدارس کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ مراسلاتی خلاء کا ہے۔ یعنی اگر ایک فارغ التحصیل علاقائی زبان سے ناواقف ہوتا ہے تو اپنے علاقہ میں پہنچ کر خصوصاً دعوتی میدان میں اس کے سامنے یہ مسئلہ خصوصیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ایک مرتبہ ہریانہ میں پیام انسانیت کے ایک جلسہ کے موقع پر جس میں شکر اچاریہ بھی موجود تھے، جس چیز کی سب سے زیادہ کمی محسوس ہوئی وہ تھی ہندی زبان سے عدم واقفیت، عوام کا ایک ہجوم تھا صحافیوں کی ایک بڑی تعداد بھی جلسہ گاہ میں موجود تھی، مدارس کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے والے ہم لوگ اردو زبان بولنے کے عادی ہیں لیکن وہاں نوعیت بالکل مختلف تھی، اس جلسے میں اردو زبان میں تقریر کرنا ایک خانہ پری تو ہو سکتی تھی لیکن اصل مقصد یعنی سامعین کو فکری غذا فراہم کرنا اور انسانیت کا پیغام سننے کا کام زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ممکن نہیں تھا، چنانچہ بہت سارے صحافیوں نے جلسے کے اختتام کے بعد مختلف مقررین کی تقریروں کا خلاصہ معلوم کیا تا کہ وہ اپنے اخبارات کو مواد فراہم کر سکیں۔ ان میں اکثر صحافی انگریزی سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اس موقع پر ہندی زبان کی اور مختلف علاقائی زبانوں کی اہمیت و افادیت اور ان سے واقفیت کے ناگزیر ہونے کا شدت سے احساس ہوا۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے طلبہ مدارس جن کا تعلق جنوبی و شمالی ہندوستان دونوں سے ہے، وہ کچھ ایسی کشاکش اور افسردگی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے حالات، وقت اور دین کے تقاضوں کے مطابق منصوبہ بندی کی نوبت نہیں آتی یہی طلبہ اگر خدمت دین کو اپنا مقصد حیات بنالیں تو ایسی منصوبہ بندی سامنے آئے گی جو وقت اور دین کے تقاضوں کو پورا کرنے اور معاشی اعتبار سے بھی خود کفیل بنانے والی ہوگی۔ اصل غلطی یا چوک ہمارے فارغین مدارس سے جو ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی منزل خدمت دین کو نہیں بناتے اگر خدمت دین ہی کو اپنا ہدف اور نشانہ بنایا جائے اور اسی لحاظ سے منصوبہ بندی کی جائے تو ان طلبہ کی نافعیت کو دنیا تسلیم کرے گی اور خدمت دین کے ساتھ انشاء اللہ ان پر معاش کی باوقار راہیں بھی کھلیں گی۔

کھوکھلا کرنے کی حماقت کون کرے گا؟

## یہ کے طلبہ وران کا حل

وہ مدارس کی خدمات کا ثمرہ ہے، نیز تحریکات  
ت ہے۔ لیکن ایک طرف جہاں وہ اغیار کے  
ب جس پر قابو پانا ضروری ہے۔ مدرسہ کے  
ب جس کہ فراغت کے بعد انہیں کیا کرنا چاہئے۔  
بہ سندھی سال سے قریب ہوتے جاتے ہیں،  
دیہی ہے اس کے حل کے لئے مدارس میں  
ہے، وہ کرتے ہیں۔ بعض رازداری کے ساتھ  
یونیورسٹی یا دوسرے اداروں سے مدرسہ کی تعلیم  
ر لیتے ہیں جب کہ مدارس کا ضابطہ اس کی  
کی فکر میں سرگرداں اور حیران و پریشان بعض  
عصری اداروں کے تعلیمی سلسلہ کو کسی نہ کسی  
نظر رکھتے ہوئے ذیل میں کچھ تجاویز پیش کی  
دل سکتی ہے۔

لی زندگی سے لے کر دعوت دین کے کام تک

نزدیک ناقابل اعتناء ہے، شریعت مطہرہ کو اصل اور اس زبان کو ضمنی کہہ کر ٹال دینا حقیقت پسندی نہیں ہے اگر مدارس عربیہ میں انگریزی کا نصاب تعلیم درست کر دیا جائے تو اسی مدت میں ایک اچھے اور صحیح نصاب کی بدولت ان کی انگریزی زبان بہتر ہو سکتی ہے۔ فارغ ہونے کے بعد طلباء یونیورسٹی جائیں یا نہ جائیں، انگریزی کے تعلق سے وہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں گے۔ اور ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اس پر اپنی عمارت خود تعمیر کر سکیں اور اگر مزید ضرورت ہو تو ذاتی مطالعہ سے وہ اپنی ضرورت کی تکمیل کر لیں۔

(۳) فراغت کے بعد دینی و معاشی دونوں فرائض کی ایک شکل یہ بھی نکل سکتی ہے کہ مدارس کے طلبہ صحافت اور ذرائع ابلاغ کی طرف متوجہ ہوں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جناب سید حامد چائسلر ہمدرد یونیورسٹی دہلی نے مدارس اور یونیورسٹیوں کے مابین رابطہ استوار اور مستحکم کرنے کے لئے اپنے وسیع تر تجربات اور ملی دردمندی کے ساتھ بہت ہی مفید اسکیموں کی طرف قوم کو متوجہ کیا، ساتھ ہی جامعہ الہدایہ جے پور کے بانی مولانا عبدالرحیم مجددیؒ کے اقدام کا یہاں ذکر نہ کرنا بددیانتی ہوگی کہ مرحوم نے مدارس کی دنیا میں ایک انقلابی قدم اٹھایا اور مدرسہ کے نصاب میں دینی و عصری تعلیم کے ساتھ تکنیکی تعلیم کو بھی داخل کیا۔ مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ایک مرتبہ اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر ہمارے مدارس کے فارغ طلبہ صحافت کی طرف متوجہ ہو جائیں تو وہ صحافت کی دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اپنا لوہا منوا سکتے ہیں ایک بڑا فائدہ تو ان کو عربی زبان سے حاصل ہوگا جس کی حیثیت عالمی زبان کی ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ذہنی سطح، فکر و سوچ اور معاملہ فہمی شریعت مطہرہ کے مطالعہ کی بدولت پختہ ہو جاتی ہے علاوہ ازیں عوام کی ذہن سازی میں میڈیا جو رول ادا کر رہا ہے اس کی بدولت افسوس ناک حد تک جمہوریت کا اہم ستون جس گھن کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ صالح اور تعمیری فکر رکھنے والے مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اس طرف کا رخ کریں اور فن میں کمال کے ساتھ صحافت کی اخلاقیات کا بھرپور عملی مظاہرہ کریں۔

و معاش اور معاد دونوں پر محیط ہو اس میں ایک کے ادب لطیف کا ذوق پیدا کرنا ہے، اس لئے اسلام کا کتاب و سنت کے مطابق لٹریچر برائے نے مرہٹی زبان کو اپنا اوڑھنا چھوٹا بنالیا تھا اور ہر مرہٹی زبان میں مکمل کر ڈالا اس کے علاوہ مائے پر حدیث شریف کی تفہیم و تشریح کا کام بھی اور ان وطن کی اسلام دشمنی یا ان کی غلط فہمیوں کے رعبہ سراپا دعوت بن جانا تو دور کی بات ہے، پہنچانے کا منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنے کے طلبہ علوم شرعیہ میں مہارت کے ساتھ اپنی لئے معا بعد پڑھ لیں تو وہ اپنے علاقوں میں جا کر نئے کلمۃ اللہ کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ کتاب و سنت کا لٹریچر یا فکری مواد موجود نہیں اس تو ایک بہت بڑا کام ہو سکتا ہے اور دین کا

مسئلہ ہے تو وہ ایک عالمی زبان ہے اس کی نکھیں چرانا ہے، جامعہ الفلاح جیسے ادارے کا حال یہ ہے کہ انگریزی پڑھنے کے باوجود نیک کے لئے بھی دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے ہوتی ہے جب کہ وہ برہنہ برس انگریزی زبان ہ وقت کا شکار ہو جاتا ہے ایک تو نصاب آخری لئے جو وقت درکار ہے وہ ارباب مدارس کے

اسلام کو دفاعی پوزیشن میں لا کھڑا کیا اس کے لئے اس وقت کے کرنے کے دو محاذ بہت اہم ہیں ایک تو اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ اور علمی سطح پر اس کا جواب دیا جائے۔ اسلام کے حسین و دلکش چہرے اور معقول و مدلل مذہب کو برادران وطن اور عالمی برادری کے سامنے پیش کیا جائے جس منصوبہ بندی اور جس عمیق مطالعے نیز جس گہری چال اور سوچی سمجھی منصوبہ بند سازشوں کے تحت اسلام کو غلط فہمیوں کے کٹھرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اس نے صاف دل افراد کے اندر اسلام کے تعلق سے تجسس پیدا کر دیا ہے اور وہ اسلام سے متعارف ہونا چاہتے ہیں۔

بھی بن سکتی ہے کہ ارباب مدارس عصری تعلیم اور اکیڈمک کورسز کے لئے از خود منتخب و چنندہ کے ہر میدان میں ان کی نمائندگی ہو سکے۔  
یا غیر ملکی ان سے الحاق کو باقی رکھنے کا، نئے میں تساہل سے کام نہ لیا جائے اس سے طلبہ بہ پیدا ہوگا اور تعلیمی فضا کے بنانے میں راہیں نئی اور فطری داعیہ پیدا ہوگا۔ مسابقت کا جذبہ کے بننے اور سازگار ہونے میں نہایت مفید

نظام کی فکری ذمہ داری بھی مدارس عربیہ پر طبقہ ایسا بھی ہو جو کارزار حیات کے مختلف لئے ساتھ ان میں کمال پیدا کرے۔  
س کی ایک روشن مثال اور دارالمصنفین کا قیام س کے فارغین کے لئے مشعل راہ ہے اور ایسے کی زبردست خدمت ہو سکتی ہے بلکہ دوسری کو اپنے شعار اور اسلامی فکر کے ساتھ تصنیف رف کرنا چاہئے۔ عرض مدعا یہ ہے کہ فارغین ن سا کام ان کے شایان شان ہے۔ طلبہ کے اسلام ایک اقدامی دین ہے اغیار میں دعوت بنتی ہے کہ ہم نے دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں آیا کہ اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مسلمانوں اور



تھا، وہ ہمارے لئے نمونہ ہیں لیکن یہ تو مصرعہ اولیٰ ہے مصرعہ ثانیہ یہ ہے کہ یہ باتیں اس دور کی ہیں جب بے سرو سامانی کا عالم تھا جب کہ آج کی صورت حال یہ ہے کہ مدارس کے پاس وسائل موجود ہیں۔

اس طرح کی اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس نکتہ پر بھی غور کیا جانا چاہئے کہ وطن عزیز میں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے لیکن ان میں باہمی ارتباط و تعاون کی کوئی ٹھوس شکل سامنے نہیں ہے جبکہ ہمارے پڑوسی ملک میں وفاق کی نظیر موجود ہے۔ اگر ہندوستان میں بھی مدارس کا وفاق ہوتا تو ہمارے اتحاد کی قوت کی برکتیں اور اس کے نتائج ہمارے سامنے آتے اور پھر کسی اور مدرسہ بورڈ، کی ضرورت کا احساس دلانے کا دروازہ ہی بند ہو جاتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ملت مدارس اسلامیہ کی اہمیت و افادیت کو سمجھتی ہے اور مدارس کے جال کو دینی تعلیم کے فروغ و تحفظ کا سب سے بڑا نیٹ ورک سمجھتی ہے اس لئے اس نے مدارس کے ساتھ مالی تعاون کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا اسلئے اگر عصری تقاضوں سے مدارس کو ہم آہنگ کرنے اور ہر جہت سے مدارس کے نظام کو خوب سے خوب تر اور معیاری بنانے کے وسائل کی بالفرض ضرورت سامنے آتی ہے تو ملت اس سے بھی دریغ نہیں کریگی۔ علماء جو قطب نما کی حیثیت رکھتے ہیں جو مسائل بلا تفریق مسلک و مشرب سب کو پیش آتے ہیں کم از کم ان مشترکہ مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ہی سہی لائحہ عمل تو بنایا ہی جاسکتا ہے۔ فراست کا تقاضہ تو یہ تھا کہ نوبت آنے سے پہلے ہی ہم پیش بندیاں کرتے لیکن اس صورت حال کے سامنے آ جانے کے بعد ہی سہی، ہم غفلت کی نیند سے کروٹ تولیں اور خود اپنا ایسا وفاق قائم کر دیں جو مدارس کے مسائل کا حل نکالنے اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل ثابت ہو سکے!!

مخالفت کافی نہیں

وفاق بنائیں!

مدرسہ بورڈ“ کے قیام سے ملت اور خصوصاً کی حمایت اور مخالفت میں آراء کے سامنے ت تو یہ ہے کہ کسی رائے قائم کرنے سے پیشتر بسا یہ اسی نوعیت کے مختلف بورڈز کی ماتحتی میں ہے کہ فقط جسم رہ گیا ہو اور روح مفقود ہو چکی لی ہو افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ دوبارڈ سے جانے کے مترادف ہوگا۔

نازک مسئلہ پر آخر ہماری ہی صف کے علماء کیا ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ ان پر سہولیات کی فراوانی سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ریغور آنے کے اسباب کیا بنے؟ اس کا جواب گنا، اولاً تو یہ کہ آخر وہ کون سی خامیاں اور افراد کو ہونا پڑتا ہے، مدارس میں تنخواہوں کی سے اور دیانت داری کے ساتھ اس پر غور کرنا دین کے لئے آخری درجہ کے ایثار سے کام لیا

بورڈ کے سابق سکریٹری اور تاریخ اوقاف کے مصنف جناب ڈاکٹر اشفاق صاحب تشریف لائے۔ ان کی زندگی کا بڑا وقت، وقف، میں گزرا اور اب بھی ان کے ارادے اس لحاظ سے جوان ہیں کہ زندگی کے باقی ماندہ وقت کو وقف ہی کے موضوع پر وقف کر دیا جائے۔۔۔ موصوف نے بڑے درد و کرب کے ساتھ بتایا کہ ”وقف“ اگرچہ مسلم پرسنل لاء کا ایک جزو ہے جس میں ذرہ برابر بھی ترمیم و تسخ نہ ہونے کی، بجا طور پر مسلمان لڑائی لڑ رہا ہے۔ لیکن ملت کا وقف سے بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے اوقاف کے سلسلہ میں خاطر خواہ واقفیت بھی نہیں رکھتی۔ اگر ایک شخص اپنے باپ دادا کی جائیداد سے متعلق ناواقف ہو تو ایک عام شخص بھی اسے نونا کارہ کہنے میں پس و پیش نہ کرے گا لیکن ملت کی اس روش کو کیا کہئے کہ اسے یا تو اوقاف سے کما حقہ واقفیت ہی نہیں اور اگر کہیں کچھ ہے بھی تو اس سے استفادہ اس کے صحیح استعمال کا سلیقہ دیکھنے میں نہیں آتا۔۔۔ چند استثنائی مثالیں ضرور ہیں مگر شاذ۔۔۔ موصوف نے بڑے کرب لیکن وثوق سے کہا کہ یہ ملت اگر اپنے اوقاف کے نظام کو درست کر لے تو انشاء اللہ وہ اپنے بل بوتے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی اور یونیورسٹیاں قائم کر سکتی ہے اور انہیں بحسن و خوبی چلا سکتی ہے۔ کس قدر افسوسناک اور المناک ہے غریب اور خستہ حال ملت کی اوقاف کی طرف سے یہ غفلت!! جس کی بدولت ملت پر اقتصادی خوشحالی اور تعلیمی ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں، افسوس کہ اس راہ کو ملت کی بے توجہی نے گویا خود اپنے ہاتھوں بند کر رکھا ہے۔ ایک طرف تو ملت کی یہ غفلت اور دوسری طرف اس کے ’کرم فرماؤں‘ کی یہ نیت کہ ایسے قوانین وضع کر دئے جائیں کہ اس دولت بے بہا سے وہ خدا نخواستہ محروم ہی ہو جائے۔۔۔ پھر ہماری اپنی صفوں کے رہنوں اور اوقاف پر ان کے ناجائز قبضوں کی ایک الگ داستان ہے۔۔۔۔۔ اس طرح اوقاف کی حفاظت اور ملت کے لئے انہیں باعث خیر و برکت بنانے کے لئے ایک تحریک کی ضرورت ہے، معاملہ زر و زمین کا ہے اس لئے مسئلہ بڑا نازک ہے اور احتیاط کا متقاضی ہے۔ صالح و خدا ترس، بے لوث و بے غرض اور بیدار مغز و جرات مند افراد کے جمع ہونے اور ان کے سامنے آنے کی ضرورت

توجہ سے  
سنور سکتی ہے

شاہ عبدالرحیم صاحب مجددیؒ کا دسترخوان بڑا  
سنان سب ہی دیکھے جاسکتے تھے۔ ان ہی میں  
آزادی کے مجاہد، عمر اسی برس سے متجاوز، خوش  
خان عبدالغفار خاں مرحوم کے عزیز و قرابت  
دوران بحیثیت مجاہد آزادی انہیں اعزاز سے  
مہم یافتہ اور صحافت سے وابستہ رہے آفریدی  
یہ کہتے رہیں اور سننے والا سنتا رہا۔ ایک بار  
توانی کے دن تھے اور جنگ آزادی بھی شباب  
صاحب سے وقت مانگا جناح صاحب نے  
آفریدی صاحب مقررہ وقت پر پہنچے، آخر کار  
حب! آپ اس وقت جاگ رہے ہیں جب  
گے۔۔۔ جناح صاحب بھی بھلا کب چوکنے  
میری قوم سو رہی ہے اس لئے میں جاگ رہا  
کے سو رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔۔۔“  
اجب ماہنامہ بانگ درا کے دفتر میں سنی وقف

## اتحاد زندگی ہے اور انتشار موت

ایک شخص کسی واقف کار با بصیرت و غیرت مند مرد مسلمان سے پوچھے کہ وہ کون سی بات ہو سکتی ہے جس پر مسلم دشمن طاقتیں متحد و متفق ہیں تو میرے خیال میں اس کا بے ساختہ جواب یہ ہونا چاہئے کہ ان کے منشاء اور کوشش کا حاصل یہی ہے کہ مسلمان اس بات کو یکسر فراموش اور اس خیال کو ذہن سے قطعاً محو کر دیں کہ بحیثیت اسلام کے پیروکار کے وہ ایک ”نظام حیات“ رکھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں Conflict of Civilization نامی کتاب کا بڑا چرچا رہا جس میں مصنف نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے دیگر مذاہب اور تہذیبیں ان کے مذہب و کلچر میں ضم و مدغم ہو سکتی ہیں البتہ مسئلہ صرف اسلام کا ہے جس کو بڑی سے بڑی اکال سرزمین نہ تو کھاسکی اور نہ نامور و نام نہاد تہذیب اسے اپنے رنگ میں رنگ سکی۔ چنانچہ اسلام کے اس خطرہ سے نپٹنے کا حل صرف ایک ہے اور وہ ہے War within Islam یعنی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کو مسلمانوں سے ٹکر دینا اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا کر دینا۔

قدم قدم پر اسلام نے امت میں اجتماعیت کی جو روح پیدا کرنے کی کوشش کی، مشکل اور ستم یہ ہے کہ اس روح کا ادراک و شعور خود امت کو حاصل نہیں جبکہ دشمن اجتماعیت کی اس انقلابی روح سے بخوبی آگاہ ہے چنانچہ اس میں نقب لگانے کی کسی کوشش کو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ اغیار اچھی طرح واقف ہیں کہ مسلمانوں کے پاس قرآن کی شکل میں ایک زندہ پیغام ہے، اسوۂ حسنہ کی صورت میں حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی اقدس ہے، مسلمان ایک تابناک ماضی کے حامل ہیں اور نتیجہ میں ان کے پاس ایک روشن تاریخ ہے، جغرافیائی اعتبار سے وہ Strategic Points کے مالک ہیں۔ خصوصاً روس کے بکھر

م سفر نہ ہو، جوائے اور اوقاف کے سلسلہ میں  
س کہ یہ تدبیر ملت کی تقدیر کو سنوارنے کا ذریعہ  
ح اس میں خود اعتمادی آئے جو زندہ قوموں کا  
وہ فرہاد جو خدا اعتمادی کے ساتھ اس سمت  
ے!! اور اس طرح وسائل و مقاصد کے امتزاج  
دے!!!

مخالفت کا رنگ دینا پسند نہیں کرتیں زمانہ کے تھپیڑوں نے امت کو باور کرا دیا ہے کہ جب اہل کتاب کے سلسلہ میں (قل یا ہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم) (آل عمران ۶۴) آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے) کی ہدایت موجود ہے تو پھر امت مسلمہ جس کی مثال سیسہ پلائی دیوار کی ہے میں فروعی مسائل کی بنیاد پر انتشار کی گنجائش کب باقی رہ جاتی ہے۔

کلمہ طیبہ کی بنیاد پر وحدت کے اصول کے مد نظر اور تحفظ شریعت کے نصب العین کے پیش نظر ۲۸/۲ دسمبر ۱۹۹۲ء کو زندہ دلان بمبئی کی میزبانی میں مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی کی ایک روشن تاریخ رقم ہوئی اور ”تحفظ شریعت“ کی ایمانی حرارت اور غیرت و حمیت کی بدولت ملت کے مختلف مسالک و مکاتب فکر کے ستاروں کی وہ کہکشاں بھی جس نے اپنے جلال و جمال کی مظہر، کارکردگی سے ”خورشید میں“ کی حیثیت اختیار کر لی جس کی ضیاء پاشیوں سے الحمد للہ ظلمتیں چھٹیں اور اندھیرے کا فور ہوئے تحفظ شریعت کے مقدس و پاکیزہ جذبہ نے شیشوں کی مسیجائی کا کام کیا اور دلوں کو جوڑا لیکن افسوس کہ تشکیل بورڈ کے اول روز سے ہی ”شب کی تاریکی و سیاہی کے رشتہ داروں“ کو اس ”خورشید میں“ سے پریشانی لاحق رہی اور ہے اب رسول اکرم ﷺ (سرکاری سیرت میں اس امت کو امت بنانے اور اس امت کو دیکھنے کا کس قدر درد و سوز اور تڑپ و کڑھن دیکھنے کو ملتی ہے۔) سے سچے عشق و محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کی بنیاد پر قائم مظلوم امت کی اس وحدت کو مزید مستحکم کیا جائے اور ہر حال میں امت کے مفاد کو ترجیح دی جائے کہ دین کا منشاء بھی یہی ہے اور وقت بھی اسی کا متقاضی ہے ورنہ مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ اس امت کا اس پر اتفاق تھا کہ وہ کبھی متفق نہیں ہوگی چنانچہ اس کا مقدر تھا کہ اس کی ہوا اکھڑ جائے قرآن کریم نے تو متنبہ کر ہی دیا ہے کہ واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفسلوا و تذهب ریحکم (آیت ۴۶/سورۃ الانفال) (اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتے رہو آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی)۔

یہ فکر برابر ستائے جا رہی ہے کہ اس امت کو ملی اپنائی جائے۔ ان کے جو حربے استعمال کیے جاتے ہیں تو تشکیک ہے کہ خود مسلمانوں میں اسلام لائیں کہ اسلام موجودہ زمانہ کا ساتھ نہیں دے گا بلکہ اللہ کر داری کی ہے تاکہ اس امت کا رشتہ اس حکمت عملی یہ ہے کہ مسلمانوں کی اندرونی

ہے لیکن الحمد للہ دوسری طرف اسلام کا سانچہ ہے اور یہ اساس امت مسلمہ کی شیرازہ بندی ہے کہ خیر امت اگر امت دعوت کا واقعی مسلم معاشرہ کو تو کیا انسانی معاشرہ کو بھی ایک قدرت رکھتی ہے۔ مگر افسوس کہ اس امت کی دوست و گریہاں ہونے میں!!

اس تہج کے دانوں کے کھیرنے کی نفسیات اسلام کی اجتماعیت کی تعلیم سے آگاہ ہونے کے باہر نہیں آنے دینا چاہتا لیکن مسلمان نہیں ہوتا وہ غیروں کی بھی آس نہیں چھوڑتا تو اور سیاسی مصلحت سے بلند ہو کر ایمان و عقیدہ پر اتحاد کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے اس یقین

جن پر آشوب حالات سے گزرتے رہے ہیں میں باہمی اتحاد کا جذبہ پیدا ہوا ہے اور ایک عام چاہتی ہیں، وہ فروعی مسائل کے اختلافات کو

تعمیر حیات کے سلسلہ میں راقم نے محسوس کیا کہ مردم سازی تو بہت بڑا اور اونچا کام ہے، دعویٰ تو درکنار، اس کا تصور بھی اس بے بضاعت کے لئے محال ہے البتہ یہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے جن نوجوان طلبہ و فضلاء میں لکھنے لکھانے کے جراثیم پائے جاتے ہوں، انہیں موقع دیا جائے اور ان کو میدان فراہم کیا جائے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے تجربہ کار اور منجھے ہوئے اسلام پسند اہل قلم کے مضامین تعمیر حیات کی زینت نہ بنیں بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہماری خواہش ہے کہ علامہ شبلی کی طرح اپنے آفتاب زندگی کے لب بام آنے سے پہلے وہ اپنی آنکھوں سے ان نوجوان صاحب قلم علماء کو دیکھ بھی لیں جن سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں، رہی ان کی سرپرستی و رہنمائی اور ان کا بیش قیمت تجربہ تو وہ ہماری قیمتی متاع ہے جس کی خیر و سلامتی کے لئے ہم متمنی بھی ہیں اور اللہ کے حضور دست بدعا بھی۔

یہ تو تعمیر حیات کی بات ہوئی گویا فقط کاغذ کی ایک ناؤ کی بات ہوئی لیکن جن کو دین و ملت کی واقعی فکر ہوتی ہے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ اورنگ زیب دیر تک سجدہ ریز ہو کر بارگاہ الہی میں ملتی رہے، جب فارغ ہوئے تو ایک وزیر نے ہمت کر کے پوچھا کہ عالی جاہ! اتنی دیر سے آپ اپنے رب سے کیا مانگ رہے تھے۔ اورنگ زیب نے فوراً جواب دیا ”مردان کا مانگ رہا تھا“

دین تو غالب ہونے کے لئے ہے وہ غالب ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کے غلبہ اور اس کی سر بلندی کے لئے مردان کا راٹھار تار ہے گا اور ایسی صفوں سے اٹھائے گا جہاں ہمارا سان و گمان بھی نہ ہوگا دعوت اسلام کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسا ہوتا آیا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے البتہ اللہ نے جن کو مردم سازی کی صلاحیت بھی دی ہے اور قدرت بھی بخشی ہے وہ اگر مردان کا رتیار کر دیں تو وہ ان کے لئے صدقہ جاریہ بن جائیں۔ اعلیٰ ظرفی اور فراخ دلی کی روشن تاریخ میں ان کا بھی نام رقم ہو، ہر غنچہ کو کھلنے کا موقع ملے اور ہر پھول کو مہکنا اور خوشبو بکھیرنا نصیب ہو، اور سپاہ تازہ کے کارنامے ان محسنوں کے بھی نامہ اعمال کا حصہ بنیں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلیل۔

## ر کا مسئلہ

دوران درس حضرت تھانویؒ کا تذکرہ آگیا کہ کی روشنی میں حضرت تھانویؒ اس لحاظ سے رکتائیں تصنیف کیں بلکہ اسی کے ساتھ مردم کے نتیجہ میں ایک ایسا کارواں بننا چلا گیا جس سے اب کہیں ایسا کام اس قدر نمایاں انداز میں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ تم صحیح کہتے مازی کی نظیریں شاذ ہی ملتی ہیں۔

سے جو لوگ متعلق رہے ہیں ان کی زبانی بھی نے اور رکھنے کی ضرورت ہے لیکن سکندرائی کی کام دل کی فراخی چاہتا ہے، وسعت ظرفی چاہتا ہے، ریاضہ شان چاہتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے ایک دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ہندوستان مل بھی ہیں لیکن اس بات کا بھی اعتراف کیا جانا ہے کچھ کوتاہیاں ملت کے خانہ میں بھی ہیں۔

کی حد تک ہی کا نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام حیثیتوں کو میدان نہیں مل پاتا، اور بقول شاعر

جاتی ہیں اور اگر حریف قوم کے بعض افراد بیداری شعور کا احساس دلاتے ہیں تو ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں دراصل دنیا ایک اسٹیج کی مانند ہے اور اس پر ڈرامے رچے جاتے رہے ہیں سب کا اپنا اپنا رول اور کردار ہوتا ہے۔ کسی کا کردار سخت گیری کا ہوتا ہے تو کسی کا شیریں بیانی اور نرم لب و لہجہ کا لیکن مقصد دونوں کا ایک ہوتا ہے۔

موجودہ استعمار کو صرف توسیع پسندانہ عزائم قرار دینا نادانی کی بات ہوگی۔ یورپ کے استعمار کی مثال ہمارے سامنے ہے جب اس نے محسوس کیا کہ محض طاقت کے بل بوتے پر اس امت کو توڑا نہیں جاسکتا تو اس نے اپنے اسکاروں اور مستشرقین کی وہ جماعت تیار کر دی جو نئی نسل میں اسلام سے متعلق تشکیک پیدا کر دے اور اسے ذہنی اور اعتقادی ارتداد کی راہ پر ڈال دے۔ نیز اس کے تہذیبی و تمدنی اور ثقافتی ورثے کو اس کی نگاہوں میں ہیچ قرار دے کر اس کے تئیں احساس کمتری پیدا کر دے۔ یہاں تک کہ وہ اغیار کو اپنا مشیر اور محافظ سمجھنے لگیں۔ لیکن آج کل جب کہ مستشرقین کی حقیقت کو دنیا جان چکی ہے، اب اسکی کوششیں ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں ہی کی صف سے بڑی تعداد میں کالی بھیڑیں اور زرخیز غلام فراہم کئے جائیں۔ جو ان کی مقصد برآوری میں مفید و کارگر ثابت ہوں۔

حاصل یہ کہ محض دھار دار خنجر، برہنہ شمشیر، بندوق کی نالیوں سے دغنے والی گولیاں، آگ کے گولے اور بم و میزائل ہی مذہبی جنون کے ہتھیار نہیں ہیں بلکہ خاموش حکمت عملی کے تحت تعلیم، ذرائع ابلاغ، مختلف شعبہ ہائے حیات میں جاری مخفی و منصوبہ بند سرگرمیاں اور پالیسیاں نیز ہماری اپنی صفوں کی کالی بھیڑیں بھی مذہبی جنون کی دور رس نتائج کی حامل پالیسی اور ذہنیت کے آلہ کار ہیں۔

غرض کہ زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے، دنیا سمٹ گئی ہے اور اب اس شاطرانہ مذہبی جنون یا (دانشندانہ مذہبی جنون کہئے) یہ تہیہ کر چکا ہے کہ جہاں بھی جس طرح سے بھی بن پڑے، چاہے طاقت کے بل پر ہو یا عیاری و مکاری کے سہارے، اسلام اور اس کے نام لیوا مسلمان نشانہ بنائے جائیں۔ جس طرح کانٹے کا جواب کانٹے نہیں اور نفرت کا جواب

## ب مذہبی جنون نہیں

ی کو مہذب بناتی ہیں، اپنے مذہب کے احترام و رواداری اور ان کی مذہبی قدروں کا اکرام و سروس کے مذہب سے نفرت کرنے کے کبھی کے عین خلاف ہے اور اگر کسی کی فطرت

حقیقت ہے کہ مذہب سے عوام کے گہرے لگاؤ سے مذہب مظلوم دکھائی پڑتا ہے کہ اس کی تے رہے۔ خود ہمارے مادر وطن کی مثال لیجئے گئے جذباتی مسائل کو لے کر آسانی کے ساتھ زندگی کا ثبوت دیتی بستیوں پر موت کے مہیب راسخ ہو جاتا ہے تو مزاج اس کے سانچے میں تے ہیں۔ نتیجہ میں ایسے جنونی انسان کو اپنے میں لگتے ہیں اور اس کا وجود ہی کانٹے کی طرح کرنے پر ٹٹل جاتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی مادی ہر شعبہ حیات میں سمجھوتہ کر لے اور اس ان کے ماضی سے منقطع کرنے کی تدبیریں کی

بہی جنون نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہوشمندی اور عقل  
الحکمت ضالۃ المؤمن۔ حکمت مؤمن کی گمشدہ  
متاع کو بھرپور طور پر استعمال میں لائیں جس  
رہی بات متاع حکمت کو برتنے کی، تو یہ کام

## افادیت و نافعیت کا لائحہ عمل

ایک حربہ تو یہ ہے کہ اپنے حریف کو اپنی طاقت و قوت کے بل بوتے پر خوف و ذلت کی نفسیات میں مبتلا کیا جائے، لیکن اس طرح کا احساس برتری دراصل احساس کمتری ہی کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایک شخص برتری کے احساس کے ذریعہ اپنی کمتری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، تجزیہ کیا جائے اور گہرائی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے تو خوف و ذلت کی نفسیات کے سلسلے میں بھی اپنے حریف کو اس نفسیات میں مبتلا کرنے کے پس پشت مقابل کے بذات خود خوف و ذلت کی نفسیات میں مبتلا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ روز و شب اور لیل و نہار کی گردش برابر جاری ہے اور عروج و زوال کا قانون برابر اپنا کام کر رہا ہے۔ کل ایک قوم طاقت و قوت میں تھی اور اسے غلبہ حاصل تھا لیکن وہ آج مغلوب اور کمزور ہے چنانچہ اس کے جرم ضعیفی کی سزا ہے کہ انتقامی ذہن کے تحت اسے خوف و ذلت کی نفسیات میں مبتلا کیا جائے۔ یہی وہ ذہنیت تھی کہ جس نے غالب کو عدالت میں طلب کر کے پوچھا تھا کہ کیا تم مسلمان ہو؟ غالب، غالب تھے ان کے مزاج میں مزاح تھا چنانچہ کہا کہ آدھا مسلمان ہوں یعنی شغل تو کرتا ہوں لیکن خنزیر نہیں کھاتا، بہادر شاہ ظفر کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا کہ ناشتہ میں اس کے بیٹوں کے سر پیش کئے گئے، رنگون میں قید کیا گیا اور جس کا سکہ چلتا تھا اسے کوئے یار میں دو گز زمین بھی نہ مل سکی۔ ہر عروج کو زوال ہے چنانچہ انگریزوں کا دور اپنے انجام کو پہونچا اور مسئلہ کالے گورے کے بجائے ہندو مسلم کا پیدا کر دیا گیا۔ اس موقع پر بھی بذات خود خوف و ذلت کی نفسیات کی شکار و گرفتار ذہنیت نے اپنا کام کرنا شروع کیا۔

عجیب منطق ہے! زندہ قوموں کی تاریخ دب دب کر ابھرنے کی تاریخ ہے۔ فرانس کو ہٹلر نے روند اگروہ پھر کھڑا ہو گیا۔ جاپان کو تباہ کیا گیا لیکن اس نے دوبارہ اپنا وزن منوالیا کیا عجیب کہ عراق میں بھی یہی تاریخ دہرائی جائے اور بات صرف جنگوں کی حد تک ہی کی نہیں ہے ہٹلر نے یہودیوں کو ذلت کے ساتھ بھٹیوں کی نذر کر دیا تھا لیکن اسکے باوجود انہیں میں سے آئن سٹائن اٹھا زندہ قومیں نہ تو خوف و ذلت کی نفسیات میں مبتلا ہوتی ہیں اور نہ شکوہ و شکایت کو اپنا مزاج بناتی ہیں۔ بلکہ کارزار حیات میں وہ اپنا لوہا منواتی ہیں۔ مسلمانوں کا طریقہ کار ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور آج بھی ان کے لئے یہی لائحہ عمل ہے کہ وہ تمام شعبہ ہائے حیات میں اپنی افادیت و نافعیت کا ثبوت دیتے رہیں۔

یوں کے ذریعہ مردم شماری کے وقت اکثریتی کی واسیوں اور شوروروں کے مذہب کے خانے بذات خود انہیں کے ذریعہ ان کی اس پالیسی ہے، اس لئے ان ذاتوں کا اندراج بھی ہندو کی سب سے بڑی اکثریت بن سکے۔ بذات اور گرفتار ہوتے ہیں اس کے پس پشت کچھ بلیہ ہے کہ جب وہ اپنے قوموں کے ہیروز قوم کے سوراؤں اور شخصیتوں کو دیکھتے ہیں تو کانٹے لگتا ہے۔ چنانچہ تاریخی حقائق سے وہ تو ان حقائق کو مسخ کر دینا چاہتے ہیں اس کے کاری کے باوجود شکوہ و شکایت کا نہیں بننا اس نشئی اور تقویت ملتی رہتی ہے۔ وہ اپنی قد آور میں چنانچہ یونانیوں کو سکندریاد ہے، نظریات لئے گا، اور وہ بابر بھی اس کے ذہن میں رہے گا جن کے مقابلے میں جس کو ۸ گھاؤ لگے تھے اور یوں کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کا کلیجہ بہت بڑا

لے حاملین کو دہشت گرد کہا جا رہا ہے۔ جن کی ہے جب کہ دہشت گردی کا تعلق بزدلی سے کیوں نقصان پہنچاتے ہیں اس لئے کہ انہیں پہلے ہی انسان انہیں ختم کر دیگا۔ اس لئے اگر وہ اپنا دفاع کریں تو دہشت گرد کہلائیں،



وطیرہ کچھ ایسا ہی رہا ہے اور یہ سب کچھ اس کمال ہوشیاری سے کیا جا رہا ہے کہ مسلم دنیا سے اقتصادی نفع بھی برابر اٹھایا جاتا رہا ہے ایک طرف کبھی اعتدال پسندی اور متوازن فکر کے اظہار کے طور پر مغرب کی اہم شخصیتیں اسلام کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی دکھائی دیتی ہیں لیکن دوسری طرف اہانت رسول کے مرتکب رشدی کو پناہ بھی دی جاتی ہے اور نام نہاد دانشور حلقہ کی طرف سے ایسے سوالات کھڑے کئے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت عام ہوتی جائے۔

تو مغربی میڈیا کی علی العموم یہ منفی روش سب پر ظاہر ہے لیکن تصویر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ الحمد للہ مسلم دنیا آبادی اور وسائل کے اعتبار سے دنیا پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں ہے خود یورپ میں عیسائیت کے بعد دوسرے نمبر پر اسلام کے پیروکار ہی آتے ہیں۔

اس صورت حال کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے کہ مسلمان بے بسی کی زندگی گزاریں اور محض حالات کا شکوہ کرتے رہیں خدا کا شکر ہے کہ مسلمان من حیث القوم اس رخ پر سوچنے کا مزاج بنا رہے ہیں۔ چنانچہ مسلم ورلڈ لیگ جرنل (MWL Journal) نے جولائی ۲۰۱۳ء کا اپنا ادارہ اسلامک میڈیا کے عنوان سے ہی قلمبند کیا ہے اور مسلم ورلڈ لیگ کے تحت World Islamic body for media کی تشکیل کی بات کی ہے جس کے مقاصد میں اسلامی کاز کے لئے کام کرنے والے ذرائع ابلاغ کی ہمت افزائی کرنا، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے کی تدبیریں کرنا اور ان کے ذریعہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا ہے، علاوہ ازیں اس کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ صالح فکر کے حامل اور ترجمان ایسے پرکشش و مقبول عام پروگرام پیش کئے جائیں جو مغرب کے لغو اور غیر اخلاقی پروگرام کی اثر پذیری کو ختم کرنے کا باعث بن سکیں نیز ذرائع ابلاغ سے اسلام کے تعارف کا بھی کام لیا جاسکے۔

الحمد للہ ملت میں یہ احساس جاگا ضرور ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ قوموں سے پیچھے رہ گئی

بیداری

نفع کی ذمہ داری

ے کو موڑنے اور متاثر کرنے میں میڈیا کا ایک عام شخص سے بھی مخفی نہیں ہے۔ نہ صرف عاشرتی ہر اعتبار سے اب میڈیا کے متاثر کن

اور اس کی اثر خیزی کا یہ عالم ہے اور دوسری صہیونیت کی دسترس اور اس کی فکر کا ترجمان اب ایک عام بات ہو گئی ہے، میڈیا خرد کو جنوں ری میں کوئی معشوق ہے جو تخریب کو تعمیر کا اور اسلام میں میڈیا کی دلچسپی اور انہیں منفی انداز میں دیکھا جاسکتا ہے مغربی میڈیا کی اسلام اور مض معاویہ میں ہے روس کے بکھر جانے اور یف اسلام ہی کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ سقوط کا بل سے متعلق جو بحثیں چھیڑیں ان سے اسلام مائیوں کو اپنانے کا مزاج بنایا جاتا نہ کہ اچھوں ہے! افسوس کہ اسلام کے تئیں مغربی میڈیا کا

## مثبت رویہ

زندگی بھی ایک سفر ہے اور ایسا سفر جس کی راہیں ناہموار ہوتی ہیں، راہ میں نشیب و فراز آتے ہیں مزا جیتیں اٹھانا پڑتی ہیں، مدافعت کی ضرورت پیش آتی ہے اور کبھی تصادم و ٹکراؤ اور کشمکش کی بھی نوبت آتی ہے۔

ان حقائق کا تجربہ انسان کی انفرادی زندگی میں بھی ہوتا ہے اور قوموں اور جماعتوں کی اجتماعی زندگی میں بھی پیش آتا ہے۔ تصادم اور ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہونے پر دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو منفی رویہ کا جواب منفی طرز عمل سے دیا جائے یا پھر صبر و ثبات سے کام لیتے ہوئے اس کے جواب میں مثبت رویہ اپنایا جائے..... لیکن منفی رویہ کا جواب مثبت رویہ سے دینا آسان کام نہیں ہوتا، یہ انسان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے، اس کے لیے پتہ مارنا پڑتا ہے، منفی رویہ کے مقابلہ میں مثبت رویہ کا مطلب بے چارگی اور بزدلی نہیں ہوتی بلکہ صحیح معنوں میں پتہ ماری، عالی حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کی بات ہوتی ہے، آخر وہ کون سی چیزیں ہیں جو اسے ہزار مزاحمتیں برداشت کرنے اور دقتیں اٹھانے پر آمادہ کر لیتی ہیں، وہ چیزیں ہیں تعمیری ذہنیت، مقصد سے عشق، مفوضہ کام کے تئیں احساس ذمہ داری اور آخرت کی جواب دہی..... ان کیفیات کے بغیر کسی شخص یا کسی جماعت کا حقیقی لحاظ سے مثبت رویہ اپنانا ممکن نہیں ہوتا مثبت رویہ اپنانے کے لئے مضبوط قوت ارادہ کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے کہ کسی کے منفی طرز عمل سے رد عمل کا پیدا ہونا بظاہر فطری بات ہے لیکن اگر قوت ارادی مضبوط ہو تو پھر ایسا شخص یا ایسا گروہ اپنے ہوش پر قوتی جوش اور غصہ کو غالب نہیں آنے دے گا۔ اور مقابل کی منفی کوششیں بے سود ہو کر رہ جائیں گی..... قوت ارادی ایک

ت کی شدید ضرورت ہے کہ وہ ہنگامی پیمانہ پر کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوششوں میں تامل نہ میں اصل دخل تو حالات کی سختی اور برہمی کا ہے بر پڑ رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ رخ دے دیا جائے۔ یہ کام بنیادی طور سے فوج کچھ بھی وسائل ہیں ان سے بھرپور کام لیا جانا کی طرف سے نہ تو مایوس ہونا چاہئے اور نہ ہی بات اور پیغام کو پہنچانے کی کوششیں ہونی

کی بدولت ملت نے جو کروٹ لی ہے اور اس اسے باقی اور متحرک رکھا جائے احساس کی یہ صحیح اور تعمیری رخ دیا جائے یہ آثار خوش آئند بدلاتے ہیں۔

ہے آج وہی اضطراب  
نہیں سکتی زباں  
سے اچھلتا ہے کیا  
بلد بدلتا ہے کیا  
نیرے کنارے کوئی  
ر زمانے کا خواب

## قول و فعل کا تضاد

منکسرانہ تکبر اور دورِ خاپن بھی اسی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں

تکبر اور انکسار! بظاہر عجیب سی بات ہے! اجتماعِ ضدین ہے! جیسے جھوٹ کے ساتھ سچ کی آمیزش کر دی جائے یا کھوٹے کے ساتھ کھرے کو ملا دیا جائے..... لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ اس سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ بستے ہیں اچھے بھی، برے بھی، سبھی طرح کے لوگ، ایسے بھی جن کے متعلق شاعر نے کہا ع ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ..... ادیب و شاعر بھی انسان ہوتے ہیں، وہ انسانوں کی بستی میں بستے ہیں، رہتے سہتے ہیں، جو کچھ کھلی آنکھوں دیکھتے اور حساس دل کی بدولت محسوس کرتے ہیں وہی ان کے نوک قلم پر آجاتا اور نثر یا نظم کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اپنے احساسات اور جذبات اور تاثرات و کیفیات کے اظہار کی سچی ترجمانی اور صحیح تصویر کشی کے لئے وہ (Figures of Speech) کا استعمال بھی کرتے ہیں کہ جس سے حسن و دلکشی بھی پیدا ہو اور اثر آفرینی بھی..... انہیں میں سے ایک صنعت تضاد بھی ہے مثلاً ”کھلا راز“ (Open Secret) یا ”عقلند ترین بیوقوف“ (Wiseest Fool) نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ ایسی مثالوں میں ایک اور مثال کا اضافہ کر لیجئے اور وہ ہے..... ”منکسرانہ تکبر“..... انسانی مزاج میں اجتماعِ ضدین کا عمل دخل کب سے ہوا یہ تو محققین جانیں۔ راقم سطور کا سا ایک انسان بس یہ جانتا ہے کہ جب سے حضرت انسان نے قول و فعل میں تضاد، ظاہر و باطن میں فرق اور دوہرے معیار کو اپنی زندگی کی ”حکمت عملی“ قرار دے لیا، تو بس دنیا کے بگاڑ میں شدت پیدا

ہے اور زندگی کے سفر میں اس کی حیثیت ایک منفی کوششوں کے نتیجہ میں پیش آنے والے سکے، منفی رویہ اور مثبت رویہ اپنانے والوں دو سودا، اور ”مکرو فن“ پر یقین رکھتا ہے جب رالماکرین کے حرف حرف پر ایمان رکھتا ہے ساز باز پر اعتماد کی نفسیات ہے جب کہ مثبت کی نفسیات..... مثبت رویہ والا مادی دنیا میں نیچے میں فی الواقعہ اسے اپنے رب پر یقین کی م، حسن سلوک اور مثبت حکمت عملی کی راہ اپناتا مر انداز کرتا ہے۔

تی ہے، وہ اسی سے مانگتا اور اسی سے فریاد کرتا بتایا ہے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ نے میں مزاحمتوں کا سامنا ہوتا ضرور ہے لیکن تا ہے اور نفع پہنچانے والی چیز کے بارے میں رہیں مزاحمتیں، تکلیفیں اور دقتیں یا اس سے ان جیسے مرحلوں سے گزرے بغیر ملتی نہیں۔ شاہد ہے۔

بہ کو اپنا کر نافعیت کا ثبوت دیا جاسکتا ہے، اور فیصلہ ہے کہ ولله العزة ولرسوله (المحققون: ۸)

چلے گا بنجارا۔ بظاہر کسر نفسی برتنا لیکن اپنے منشا اور مرضی کے خلاف صاف اور سچی بات کو قابل اعتناء نہ سمجھنا بھی منکسرانہ تکبر کی ایک مثال ہے اور انکساری کی اوٹ میں ایک کھوٹ کو برتنے کی ایک ایسی کوشش ہے جو آخرت میں خدا نخواستہ مہنگی ثابت ہو سکتی ہے قرآن نے تو صاف اعلان کر دیا ہے۔

فمن يعمل مثقال ذرة خیرا یرہ ☆ ومن يعمل مثقال ذرة

شرایرہ ☆ (۸۷/۹۹)

رے معیار کی کوکھ سے معلوم نہیں کتنے عیوب کی جنم داتا بھی یہی ہے۔ منکسرانہ تکبر کے من صورت، اور دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو میں شیرینی ایسی جیسے مصری کی ڈلی منھ میں لہار گویا ضرر رسانی سے بالکل پاک و صاف ری ہی ظاہر داری ہے۔ قریب جاییے اور خدا مل کا تضاد کچھ اس بری طرح سامنے آئے گا ”نفسانیت“ نکلی، بظاہر بے ضرر دکھائی دینے کی شان سمجھی جاتی تھی، کھری بات کو اس نے پکی بات اور کس قدر حقیقت پسندانہ تعریف جو دل میں کھٹکے وہ گناہ ہے۔ کبر بھی گناہ ہے۔ ہے جس کے پھل بڑے کڑوے کیلے ہوتے ہے۔ ایک پر یوار کی طرح ایک دوسرے سے مددگار۔ ان کڑوے کیلے پھلوں میں سے ایک

پاک رکھنے کی تاکید کی، انا سے دامن چھڑانے (Advance) ہوا چاہتی ہے تو پھر انا کیوں نے نہاں خانہ میں کہیں چھپ کر بیٹھتا اور گھات وہ رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا اور ہمہ ایک بڑا کارگر ہتھیار اور خوشامد اس کا آزمودہ۔ بس تکبر اور انا بھی انکساری کی اوٹ میں اپنی جاتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے، چار دن کی چاندنی سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لا

ہیں۔ ایک بنیاد ہے مفاد کی بنیاد اس کے برعکس دوسری بنیاد ہے اصول و اقدار کی بنیاد، مفاد کی بنیاد پر کیا جانے والا تعاون ریت کے گھروندے کی مانند کمزور ہوتا ہے جو ہوا کے ایک تیز جھونکے کی زد میں ہی اپنا وجود کھوسکتا ہے۔ جب کہ اصول و اقدار کی بنیاد پر کئے جانے والے تعاون کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس کا وجود طوفان کی بلا خیز موجوں کے تھیرٹھروں کے باوجود بھی قائم رہتا ہے۔

مکراؤ یا بے بناؤ کی بھی دو جہیں ہو سکتی ہیں ایک وجہ ہے بغض و عناد اور اس کی بناء پر کی جانے والی مخالفت، دنیا کا اکثر و بیشتر فساد اس بیمار ذہنیت کی بدولت ہے کہ جو کچھ ہو، اچھا ہو یا برا، بس ہماری چھتر چھایا میں ہو۔ مخالفت کی ذہنیت دراصل ایک بیمار ذہنیت ہے۔ جو مریض کے تعصب و عناد اور بغض و محاسنت کے مرض میں مبتلا ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن مکراؤ تو نہیں، البتہ بے بناؤ کی ایک دوسری وجہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ ہے ”اختلاف“ لیکن اختلاف کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اختلاف ذاتی یا گروہی عناد کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ اصول و نظریات اور پالیسی کے مابین فرق کی بنیاد پر روا رکھا جاتا ہے۔ اصول و نظریات اگر صالح ہوں اور ان کی بنیاد نفرت پر نہ رکھی گئی ہو تو ایسے اختلاف کی نوعیت تعمیری اور مثبت ہوتی ہے اس لحاظ سے مخالفت اور اختلاف دو مختلف چیزیں ہیں دونوں کے سرے الگ الگ ہیں اور دونوں کا رد عمل بھی مختلف ہے۔ مخالفت کی ادائیں شریفانہ و جارحانہ اور بز دلانہ ہوتی ہیں۔ جب کہ اختلاف کی ادائیں شریفانہ و مخلصانہ اور جرأت مندانہ ہوتی ہیں۔ مخالفت کا جذبہ اپنے حریف کو ناکام و نامراد دیکھنا چاہتا ہے، جبکہ اختلاف رکھنے والا اپنے نظریے کے مطابق اپنے حریف کی اصلاح کا طالب ہوتا ہے۔ مخالفت مکراؤ کا سبب بنتی ہے جب کہ اختلاف زیادہ سے زیادہ بے بناؤ کا۔

اصول و نظریات کا اختلاف اور تنوع ہمیشہ سے رہا ہے اور رہے گا۔ جب پانچ انگلیاں برابر برابر نہیں ہوتیں، یا ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں بعض دفعہ کسی ایک مسئلہ پر اتفاق رائے نہیں ہو پاتا تو مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں مختلف زبانوں کے بولنے

## مکراؤ کا روگ

لوک سبھا کے اسپیکر کے باوقار منصب کے لئے منت پارلیمانی سیاست کے ایک قد آور رہنما اور پارلیمنٹ کی طرف سے مبارکباد دئے جانے کیلئے غور طلب ہے۔ موصوف نے کہا کہ ہے۔ اور یہی چیز ایوان میں بھی پائی جاتی ہے۔

مکراؤ عوام کے ذہن کو بدل سکتے ہیں۔ اور دردمندی دونوں پر مشتمل ہے، سیاسی حال اب اس قدر کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اس نے اس کا سمجھنا اور سمجھانا اس قدر آسان نہیں رہا۔ اس کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ محترم چترجی صاحب کی حیثیت سے کہی، چنانچہ پارلیمنٹ ہی ان کے لئے ایک ”مکراؤ“ ہے تو تعاون سے زیادہ مکراؤ کے گہرائی میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ عوامی اداروں میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ تعاون اور تباہی کے سامنے آتی ہے کہ ایک شخص کے دوسرے جماعت کے ساتھ تعاون کی دو بنیادیں ہو سکتی

## واقعیت پسندی کی اثر خیزی

اعتراف حقیقت بھی بڑے ظرف و حوصلہ کی بات ہے، جذباتیت کبھی انسان کی ضرورت و مجبوری بن جاتی ہے، اور اس رو میں نہ صرف انسان بہہ جاتا ہے بلکہ قیادت کی صلاحیت کی بنا پر ہزار ہا انسانوں کو بہا بھی لے جاتا ہے، یہ رو کبھی موج بلا بھی بن جاتی ہے، اور ان گنت بے گناہ انسانوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے بد قسمتی سے ہمارے مادر وطن میں مذہبی جذبات اکثر و بیشتر جنون کی شکل اختیار کر گئے اور یہ سب یا تو اقتدار کے لئے ہوا یا کبھی اقتدار کے نشہ میں چور ہو کر کیا گیا یا پھر کسی خاص مقصد برآوری کے لئے نفرت کی وہ آندھی چلائی گئی جس نے انسانی بستیوں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ مذکورہ منفی جذباتیت یا مذہبی جنون کی بنیاد ہی نفرت و عداوت اور مخاصمت پر ہے اور اس کے پس پشت اقتدار کا وہ حصول بھی ہے کہ جس کے لئے اصولوں کی دہائی دینے والوں کو عارضی طور پر ہی سہی اپنے اقتدار و اہداف کو ٹھنڈے بستے میں ڈالنے پر رضامند ہو جانے پر کوئی عار نہیں محسوس ہوتا۔

لیکن انسان کی زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب اس کو منفی جذباتیت کے بجائے واقعیت پسندی اور مفروضہ کے بجائے حقیقت پسندی کا احساس ہونے لگتا ہے، وہ نقشوں کو جانچتا بھی ہے اور لوگوں سے مل کر دیکھتا بھی ہے تو پھر یا تو اس کے اندر کا انسان جاگ اٹھتا ہے یا تعصب کی آنچ اور نفرت کا زہر کم ہونے لگتا ہے اور تعصب و عصبیت کی عینک ہٹا کر حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ ضمیر کی آواز کو زیادہ دنوں تک نہیں دبایا جاسکتا۔ اس کی ایک مثال ہمارے اپنے وطن کی ہے۔ اس ملک کی

عوام کے ایک رنگ میں رنگ جانے کا ایک لمبی بات کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہ ہماری نسل سے لے کر آج تک کثرت میں وحدت ہمارا رہنما اصول رہا ہے۔ وطن سے سچی محبت تھی، ہمہ جہت ترقی، اجتماعی اور مجموعی ترقی کی کے ہر میدان میں ہم کامیابی کے جھنڈے کی بھی کہ اس کی روشنی ایک ایک غریب کی ہر سورج طلوع ہونے کے نصف صدی بعد بھی یہ خواب ایک ایسا خواب ہے جس میں مخالفت چھائیاں دکھائی نہیں پڑتیں، لیکن اس خواب کی ضرورت ہے۔ اور تعاون ایثار چاہتا ہے، کام کا کم از کم مشترکہ پروگرام جو بھی ہو، عوام کی لم مشترکہ پروگرام تو یہی ہے۔ وطن سے سچی اجتماعی اور مجموعی ترقی یعنی ہر میدان عمل میں بھی ایک فرد کیلئے بھی راحت و خوشحالی۔ جس روز لگی میں ”ٹکراؤ“ کے خاتمہ کا اور باہمی تعاون طرف لے جانے والا راستہ ہے۔ جب کہ سیاسی اسٹیج پر تعاون و ٹکراؤ، کا یہ تماشا ہوتا آیا اور پر اس کا نفع و نقصان بھی پہونچتا رہا ہے۔ کو نوٹ کرتی ہے اور محفوظ رکھتی ہے۔ اس کی وطن سے وفا کا معاملہ کس نے کیا تھا! اور اس تھا!!۔ اور اس سے پہلے تو اپنے جمہوری حق

یہی، اس کی پسماندگی کی تدابیر کی جاتی رہیں۔  
 یا گیا اور ستم یہ کہ ملت قسطوں میں خاک و خون  
 کا درد رکھنے والوں نے پورے سوز و اخلاق  
 اکثریت کو نظر انداز کرنا اور اس کو تو انائیوں  
 کے محروم رکھنا یا پھر مادر وطن کیلئے ان کی قابلیت  
 سارہ کی بات ہے۔ لیکن نشہ کئی ایک چیزوں کا  
 نشہ! چنانچہ مذکورہ بالا حقیقت کے بجائے دوسرا  
 رکھے بغیر کوئی اقلیت سکون سے رہ نہیں سکتی  
 تمام ثابت ہوا۔ اور ثانی الذکر فلسفہ نے اقتدار  
 کر دیا۔ اس ناکامی و محرومی نے بھی احساس  
 پر تعصب اور تصادم کی پالیسی اپنانے سے  
 ہے تو اکثریت بھی اسکی وجہ سے خسارہ میں  
 رہے لیکن جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس  
 برگ و بار لانے کیلئے وقت طلب اور فضا کے  
 ہوتا ہے لیکن قدرت نے انسانی فطرت میں  
 اپنا اثر دکھاتی ضرور ہے اور محبت کا فرمانہ بھی  
 کسی نہ کسی مرحلے پر ناگزیر ہو ہی جاتا ہے۔  
 وہ کسی کے دل میں سچائی کا بیج بودے اور اس  
 طاقت ہے جو نعوذ باللہ اسے اس سے باز رکھ  
 خانہ سے کعبہ کو پاسباں فراہم کر دینے کی اپنی  
 جوت جگا دے اور اسے حقائق کے ادراک  
 میں حیرت و استعجاب کی کیا بات ہے اور اس

کی قدرت کاملہ سے کیا بعید!! نہ تو ہمیں کوئی خوش فہمی ہے اور نہ خوشی بلکہ انسانی فطرت کے  
 اس خاصہ کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ صداقت و حقیقت وہ قوت ہے جو عمر بھر اس کا انکار کرنے  
 والے سے بھی ایک نہ ایک دن اس کا اعتراف کروا ہی لیتی ہے چاہے وہ محبت کی شیرینی کی  
 وجہ سے ہو یا سچ کی کڑواہٹ کی بدولت! اسلام کی تاریخ بھی اس بات پر شاہد ہے، واقعیت  
 پسندی سچائی کا وہ سرچشمہ ہے جو دیر سویرا بلتا ضرور ہے اور کثافتوں اور کدورتوں کو دھل کر رکھ  
 دیتا ہے۔ الایہ کہ دلوں پر مہر نہ لگ گئی ہو!

## آگ اور مٹی کی کشمکش

محبت اور نفرت کے جذبہ کی کار فرمائی:

دنیا میں پیش آنے والے واقعات پر غور کرنے والا غور کرے تو اُس کا اس نتیجہ پر پہنچنا بے جا نہیں ہوگا کہ انسانی اعمال و افعال کے پس پشت یا تو محبت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے یا پھر نفرت کا جنون کام کرتا دکھائی دیتا ہے، جب قلب انسانی میں محبت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے تو روئے زمین پر ایک تاج محل ڈھل جاتا ہے اور جب نفرت کا جنون جوش مارتا ہے تو عبادت گاہیں مسمار کر دی جاتی ہیں۔ محبت و نفرت کے جذبہ کی نوعیت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ اجتماعی جذبہ کے عام کئے جانے کے پس پشت کوئی تحریک ہوتی ہے مثلاً اسی دیش میں صوفی سنتوں اور ریشیوں مٹیوں نے محبت کی تحریکیں چلائیں اور نتیجہ میں یہ سرزمین نازک و چشتی کی سرزمین کہلائی، انہوں نے ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کا کام کیا، شیشوں کی مسیجائی کا کام کیا، خلیجوں کو پاٹا اور سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک آملے، ان صوفی سنتوں اور ریشیوں مٹیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اکرام انسان کے فلسفہ کو لے کر چلے، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ رہے ہوں یا فرید الدین گنج شکرؒ، سب اسی کہکشاں کے زریں ستارے ہیں۔

محبت گلستاں تعمیر کرتی ہے:

اکرام انسان کی بات وہی کر سکتا ہے اور نہ صرف بات، بلکہ عمل کی کسوٹی پر کھرا بھی وہی اتر سکتا ہے جس میں تواضع ہو، انکساری ہو، اور جس کو یقین ہو کہ ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم تو مٹی سے بنے تھے! اپنے مٹی سے ہونے اور مٹی میں مل جانے نیز مٹی ہی سے دوبارہ

## پیغام کی تھی

خونی اور موت کے استقبال کے جو نقوش دفتر چاہئے، ان کے پیش نظر بشارتیں رہیں، پرے بھی ایسا بھی ہوا کہ سر پر سوار موت کو مہلت مل جائے۔ مثلاً ایک واقعہ ایک عالمی میں ایک شخص ان کے قتل کے ارادہ سے گھس رہا تھا اس شخص کی طرف دیکھا اور بڑے اطمینان سے بولے تو پھر تم جو چاہو کرو۔

تحریر کی نہیں، بلکہ اس کے ذریعہ دئے جانے والے شاعر چاہے گا کہ اس دنیا سے وہ کہیں اس کا پیغام ناقص رہ جائے۔

اپنے پیغام کے تئیں اس کی فکر مندی کی۔ اب والے ایک مسلمان کی طرف جو ایک داعی بھی ﷺ لے کر آئے تھے..... غور طلب بات یہ یہ کہ روئے زمین سے اپنے پیغام کے تئیں جس فکر فرد کی حیثیت سے ہم میں بھی پیغام محمدی کو ملو بہ سچی تڑپ لگن موجود ہے؟

دعوت و پیغام ہے۔ دعوت و پیغام سے خالی سے خوشبو کی توقع نہیں کی جاسکتی۔



مٹی کی تاثیر خاکساری ہے اور آگ کی تاثیر استکبار و احساس برتری  
 ویسے لطف کی بات ہے کہ چمن کی گلکاریوں کا تعلق مٹی سے ہے اور شعلہ کی لپٹ کا  
 تعلق آگ سے ہے۔ مٹی مٹنے اور خاک میں ملکر گل و گلزار ہونے کا پیغام دیتی ہے اور آگ  
 مٹانے کا جنون ابھارتی ہے۔ یہ شاید مٹی کی تاثیر ہی تھی کہ جس نے باوا آدم سے کہلوا یا تھا کہ  
 ہم نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا اس لئے بار الہا! اگر تو نے ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اور خسارہ  
 اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے اور یہ شاید آگ کی تاثیر تھی کہ ابلیس نے آدم پر اپنی  
 برتری کی دلیل یہ دی کہ آدم تو مٹی سے بنے ہیں جبکہ میں شعلہ کی لپٹ سے، مٹی کی تاثیر  
 عاجزی اور فروتنی ہے اور آگ کی تاثیر تکبر و استکبار اور احساس برتری!!!

انسان کا مادہ اُنس ہے یعنی اُنس و محبت، گویا جو انسان اُنس و محبت کا حامل ہوتا ہے وہ  
 اپنی فطرت پر قائم رہتا ہے اور مٹی سے بنے آدم کی طرف اپنی نسبت کی توثیق کرتا ہے لیکن اس  
 کے برخلاف جو تکبر و استکبار اور احساس برتری کے پندار میں مبتلا ہوتا ہے گویا مٹی کے بجائے  
 شعلہ کی لپٹ سے اپنی مناسبت کا اعلان کرتا ہے اور خود اپنی فطرت سے جنگ کر رہا ہوتا ہے۔

نفرت کی بنیاد ”احساس برتری“ ہے:

حاصل یہ کہ نفرت کی بنیاد ہے احساس برتری! تکبر و استکبار! دوسروں کو ذلیل  
 و حقیر سمجھنے کا مزاج!

دنیا کی تاریخ میں اس احساس برتری نے بڑے ستم ڈھائے، بڑی آفتیں پھینکیں،  
 دنیا کو خاک و خون میں نہلایا، انسانی لاشوں کے پُشتے لگائے اور حیوانیت کا وہ ثبوت دیا کہ  
 درندے بھی کانپ جائیں، مٹی سے ہونے کی اپنی حقیقت کو یاد رکھنے والا انسان جب بلندی  
 کی طرف اٹھتا ہے تو ملائکہ کو اس پر رشک آنے لگتا ہے جبکہ شعلہ کی لپٹ سے مناسبت رکھنے  
 والا آدمی جب گراوٹ پر اترتا ہے تو درندوں کو بھی شرمادیتا ہے اور اسفل سافلین کی منہ بولتی  
 تصویر بن جاتا ہے۔ احساس برتری کی یہی وہ ذہنیت تو تھی جس نے ایک قوم سے اپنے متعلق

ہے، اس میں لازمی طور سے خاکساری پیدا  
 نئے اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کو بلندی عطا کرتا  
 یوں کو چھونے والا بن جاتا ہے، زمین کی سی  
 گہرائی و گیرائی اسے نصیب ہو جاتی ہے، اس کا  
 تے چلے جاتے ہیں، اور دنیا ع

رگ و بار لاتی ہے اور تعمیر گلستاں کا کام ہونے  
 کی ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر بنا دیتی ہے کہ  
 ت ملکوتی ہے۔

کا مجموعہ ہے، یہاں دن کے ساتھ رات بھی  
 ت کے ساتھ نفرت کا بھی وجود ہے، محبت اگر  
 تے ہیں تو چمن در چمن کھلاتے چلے جاتے ہیں  
 بنگاری جب شعلہ بنتی ہے تو خرمن کو جلا کر راکھ  
 سانی آبادیوں کو ویرانوں سے تبدیل کر دیتی  
 کرتا رہتا ہے، جبکہ شعلے آگ لگانے، جلانے  
 سڑاند اور بدبو پھیلانے کا سبب بنتے ہیں وقتاً  
 میں وہیں دنیا کو نفرت کی خزاؤں اور اس کی  
 بہاریں بغیر کوشش کے چلیں اور نہ نفرت کی

یہی ذہنیت ہے جو انسانوں کی طبقاتی تقسیم  
سمجھنے سے کھلم کھلا انکار کرتی ہے۔

## جونری سے محروم ہے وہ خیر سے محروم ہے

دنیا میں شور مچا رہا ہے کہ دہشت گردی عالم کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ دہشت گردی کی تعریف (Definition) بھی ہنوز ایک معمہ بنی ہوئی ہے اور اب تک عالمی پیمانہ پر دہشت گردی کی ایسی متعین اور جامع تعریف نہیں بیان کی جاسکی ہے کہ جس سے دہشت گردی کا مفہوم اور اس کے معنی متعین ہوں۔ اگر اصطلاح کی تعریف واضح ہوتی تو اس کے معنی متعین ہوں۔ اگر اس اصطلاح کی تعریف واضح ہوتی تو اس کی روشنی میں احکام اور سزاؤں کا نفاذ بھی ممکن اور آسان ہوتا اور اس صورت میں دنیا میں امن و امان کا قیام اور قانونی آزادیوں کا تحفظ ہوتا نیز انصاف کے تقاضے پورے ہوتے۔

حاصل یہ کہ کوئی ایسی اصطلاح جو مبہم ہو، وہ قوموں کی زندگی پر نہایت منفی اثرات مرتب کرتی ہے، شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے اور تخریب کاری مچاتی ہے، اس کی ایک بدترین مثال دہشت گردی کی اصطلاح ہے۔ تاریخ کا یہ ایک ایسا المیہ ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین، دین رحمت بنا کر دنیا کے لئے بھیجا گیا اس پر دیدہ دلیری کے ساتھ تشدد پسندی کا الزام اور علیحدگی پسندی کی تہمت لگائی جاتی ہے جبکہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی شریعت کے احکامات نہ صرف ان الزامات کی تردید کرتے ہیں بلکہ اسلامی تاریخ کی سچائیاں بھی ان اتہامات کی نفی کرتی ہیں۔

مسئلہ کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو سیاست، قانون اور فقہ کے ماہرین دہشت گردی کی جامع و متعین تعریف طے کریں اور دوسری طرف دہشت گردی کے اسباب

کا یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گی اس  
ز کرنے والے شیطان نے قیامت تک کے  
آدم میں بھی تو اس سے نیٹنے کی صلاحیت رکھ  
میں ضرور فریاد و التجا کا تھا، تضرع اور آہ و زاری  
یہ کش مکش چلتی رہی، انبیاء و رسل آتے رہے،  
لائے اور دنیا نے چراغ مصطفوی سے شرار  
پر جو ہدایتیں آتی رہیں ان میں ایک ہدایت و  
لوٹو) کی ہے، ایک ہدایت اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ  
طرف حکمت و موعظت کے ساتھ بلاؤ) کی  
ن قُوَّة کی بھی ہے تاکہ تخریب گستاں پر تعمیر  
می یہی ہے، اگر ایک کہار کو اپنے ہاتھوں سے  
رنج ہو سکتا ہے تو پھر اس کائنات کے خالق  
تکلیف ہوتی ہوگی! اس کا فرمان بھی تو ہے: لا

قوت سے کھیلنا جا رہا ہے، مٹی سے بنے آدم کی  
وں کو جمع کریں اور احساس برتری کے شکار اور  
جب آگ کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں  
پنے ہاتھوں پر اپنی بربادیوں کا سامان نہ کرو۔

## جرم ضعیفی کی سزا

بغض وعدوات رکھنے والوں کی کرم فرمائیاں بھی نت نئے روپ دھارتی اور آسمان کی طرح رنگ بدلتی ہیں۔ دو گروپ یا جماعتیں برابر طاقت و قوت کے مالک ہوں تب ہی وہ حریف کہلائے جانے کے مستحق ہیں ورنہ بھیڑ یا اور بکری کی لڑائی کو بھی بھلا کہیں مقابلہ آرائی قرار دیا جاسکتا ہے۔؟ اس وقت دنیا جہان کا جو نقشہ ہے اور جا بجا بظاہر باہم دست و گریباں ہونے کا جو منظر دکھائی دے رہا ہے اس کی مثال بھی بھیڑیے اور بکری ہی کی لڑائی کی سی ہے۔ حریف نہایت خونخوار و طاقتور اور نحیف و کمزور بکری پر حملہ آور۔ اب یہ اور بات ہے کہ کبھی بکری ابو خاں کی بکری ”چاندنی“ کے کردار کی حامل بکری ہو جو خونخوار بھیڑیا کے آگے گھٹنے نہیں ٹیک دیتی بلکہ اپنے انجام کو جانتے ہوئے بھی دفاع کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ اور ع مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ کاسماں پیش کرتی ہے بالآخر درندہ بے گناہ ”چاندنی“ کو دبوچ ہی لیتا ہے لیکن ایک ٹہنی پر بیٹھی ہوئی بوڑھی چڑیا یہ فیصلہ سناتی ہے کہ ”چاندنی جیتی“۔

کسی بھی ظالم حریف کا ہمیشہ سے ایک موثر ہتھکنڈہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے کمزور مد مقابل کو خوف و ذلت کی نفسیات میں مبتلا کرتا رہے اور ایسے مقدس مقامات اور ایسی محترم شخصیات کو جو کسی قوم و ملت کی شوکت و عظمت یا احترام و عقیدت کی علامت (Symbol) سمجھے جاتے ہوں ان کو اپنا ہدف و نشانہ بنائے، ان کی تحقیر و تذلیل (Demoralise) کرے اور ان پر خوف و دہشت کے سائے منڈلاتے رہیں۔ نائنک و چشتی کی سرزمین پر خوف و ذلت کی نفسیات میں مبتلا کرنے کی تو اپنی ایک طویل داستان ہے جس کی ایک کڑی اہنسا کے پجاری باپ کی سرزمین پر گزشتہ برسوں کھیل جانے والا وہ رقص ابلیس ہے جس کی بازگشت اب تک سنائی دے رہی ہے۔ ملک کی سب سے بڑی عدالت

۲۱۵  
- معاشرے میں پنپنے والا ظلم و دہشت گردی کا بنیادی سہولتوں سے محرومی جرائم کی جنم داتا پر بے بنیاد حملوں کا سلسلہ بھی ایک اضطراب ہے کہ اقتدار کے حصول کا جذبہ طوائف الملو کی جہاز امکان نہیں ہو سکتی کہ ایسے اقدامات کے دھماکوں اور دھمکیوں کی کاروائیوں سے دنیا بھر چاہتا ہو کہ نعوذ باللہ مسلمان ایک غارت خان و امان، تہذیبی قدروں اور انسانی حقوق کا ہاتھ آگے کار بننے والے نادان یہ بھول جاتے امیہ کے مصالح کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکی رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ کاش کہ ان کے ہوتا کہ اللہ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند فرماتا ہے، سو کسی دوسری چیز پر عطا نہیں کرتا۔ (مسلم) و نرمی سے محروم ہے وہ خیر سے محروم ہے۔ سچی س کے لئے اسی در کی محتاج ہے جو در اللہ کا اور صرف مسلمانوں کے مفادات کی نگہبان ہے اس کے سایہ عاطفت میں پناہ لیں، قرآن کا من خلفہ، تنزیل من حکیم حمید“ (حم) سامنے سے باطل آسکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ

سے شریعت اسلامیہ پر عمل ہی امت کو شکوک  
ثناء اللہ، اللہ کی نصرت بھی آسکتی ہے۔

## اجتماعی اور مجموعی ترقی

کامیابی و ترقی کی راہ ہر ایک پر کھلی ہے۔ اور وہ راہ ہے کہ کوشش و جدوجہد کی راہ، پیہم رواں ہر دم دواں رہنے کی راہ، چلتے رہنا زندگی اور رک جانا موت کے مترادف ہے، زمانہ مروت سے آشنا نہیں ہوتا جو اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دیتا ہے اسے عروج کی منزلیں طے کراتا ہے اور جو اس کا ساتھ نہیں دے پاتا اسے روند کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ ”لیس للانسان الا ماسعی“ کا اصول، فرد ہو یا قوم، اس کی کامیابی کی شاہ کلید ہے۔ اس دارالاسباب میں جو بھی اس شاہ کلید کو اپنالے، کامیابی اسی کے قدم چومے گی اور عروج و اقبال اسی کا مقدر بنے گا۔ روحانی اعتبار سے بیمار اور فکری اعتبار سے مریض قوموں نے بھی اپنی ان کمزوریوں کے باوجود جب جہد مسلسل، منصوبہ بندی اور پابندی وقت جیسی قدروں کو اپنایا تو مادی لحاظ سے ہی سہی، جاہ و منصب اور مادی ترقی و خوشحالی کے دروازے ان پر کھل کر رہے اس لئے کہ قدرت کا نظام ہے کہ وہ کوششوں کو ضائع نہیں کرتی اور انہیں راہیں گان نہیں جانے دیتی۔

اس بنیادی اصول کی روشنی میں ہم اپنے آپ کا اور اپنی ہمسایہ قوموں کا دیانت داری سے جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ ہماری مثال اس مریض کی سی ہے جس کو اپنے مرض کا احساس بھی ہے اور طبیب حاذق کا تیر بہدف نسخہ بھی اس کے پاس موجود ہے لیکن بس قصور ہو رہا ہے تو اتنا کہ وہ اس نسخہ کو استعمال میں لاتا نہیں!!! جبکہ اسے قدم قدم پر اجتماعیت کا سبق پڑھایا گیا، دن میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت اس کو یہ سبق یاد دلانے کے لئے کافی ہے لیکن اس کی صفوں کی کچی نہیں جاتی! مجموعی حیثیت سے ایک دوسرے کا پاس و لحاظ رکھنے اور باہمی تعاون کی بھی جا بجا تعلیمات دی گئیں۔ ”حقوق“ کے مستقل باب کتابوں میں قائم

پر بھی ہمارے سامنے سقوط کا بل سے لے کر لڈکر ”گنہگاروں“ کا قصور یہ تھا کہ وہ اسلام کو س ماننے تھے۔ بلکہ اسے وہ دین تسلیم کرتے ”مجرم کا معاملہ، تو اس کا جرم یہ تھا کہ وہ جری تھا، ع سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں راسی لئے اہل دانش و ہنیش کا نہ سہی مگر عوام کا س نہ سہی بغض معاویہ میں ہی سہی (وہ ہیرو بننا لت کی نفسیات میں اسے مبتلا کیا جانا بھی طے کا دفاع مقصود نہیں البتہ یہ ضرور یاد دلانا ہے کہ نے کی عیار دشمن کی تاریخ تو پرانی ہے ہی۔ دور نہ ریکہ نے کمال ہوشیاری سے کس کے خون کو مگر کر بناک حقیقت کو جانتی ہے کہ کمیونزم اور خون سے لالہ زار بنائی گئی تھی وہ کسی اور کا نہیں امہ رچایا گیا اور جب مقصد حاصل ہو گیا تو پھر ٹل دے دیا گیا اور ان کو نیست و نابود کرنے ل کوروؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

ملت عثمانیہ (Great Ottoman) متل ہوا کرتی تھی۔ اور آج دنیا کے نقشہ سے حصے بخرے ہوئے کہ ترکوں کے پاس ترکی امریکی استعمار کی زد میں ہے۔ اور امریکہ دباؤ بنا رہا ہے کہ امریکی مقاصد کیلئے ترکی کی

بھی جرم ضعیفی ہی کی سزا کی ایک شکل ہے۔

## میڈیا کی کرشمہ سازی

ایک چیز ہے خبرنگاری اور دوسری چیز ہے خبر سازی، ایک مدت سے اسلام اور مسلمانوں کے معاملات میں میڈیا عموماً خبر سازی کے رویہ کو اپنائے ہوئے ہے۔ جس صحافت کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے کبھی جمہوریت کا چوتھا ستون سمجھا جاتا تھا افسوس کہ ادھر ایک مدت سے بحیثیت مجموعی صحافت کا کردار نفع رسانی کا کم اور ضرر رسانی کا زیادہ ہو گیا ہے۔ اور اس کے غیر ذمہ دارانہ رویہ ہی کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سیاسی بازی گر آج ایک بیان دیتے ہیں اور دوسرے دن میڈیا پر اسے توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا الزام عائد کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہیں اس لحاظ سے اس تضاد کا مشاہدہ ہو رہا ہے کہ ایک طرف تو میڈیا موثر قوت و طاقت ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنا اعتبار کھودینے کی وجہ سے اس کے عموماً عضو ضعیف ہونے کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے دراصل کذب، جھوٹ، بہتان تراشی اور اپنے ذرا سے مفاد کیلئے دوسروں کیلئے استحصال کا جسے دوسرے لفظوں میں خبر سازی کہہ لیجئے۔ صحافت سے وابستہ ذمہ داران کیلئے یہ امر لمحہ فکریہ ہے کہ آیا مستقبل قریب میں صحافت کا رشتہ اعتبار و اعتماد سے استوار رہے گا یا بے اعتباری اور کذب بیانی سے عبارت ہوگا۔ صحافت ہمارے نزدیک قیادت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن وہ قیادت ہی کیا جو عام بھیڑ کے پیچھے چلتی ہو۔ اور اس کی عمومی رائے اور نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا رخ طے کرتی ہو۔

عمرانہ کیس گزشتہ کئی ہفتوں سے اب تک موضوع بحث بنا ہوا ہے اور اس پر اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی، علماء نے بھی اور غیر علماء نے بھی، اہل اور نااہل سب نے خوب

کئی ہوئی دیوار بن جائے۔ ایک طرف اجتماعی رہ سے ٹوٹے گانہیں اور کارواں سے چھوٹے دیا گیا کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہ رہے کوئی کمی و کسر رہ جائے، کارواں چلے اور پوری س کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے اور ترقی کے ل گامزن رہے۔

منصوبہ بندی جو دردمندی و دلسوزی اور اس الب ہے۔ ایک ایسا ہمہ گیر منصوبہ جس میں محاذوں پر مخلص و اہل سپاہی ہوں جو پیچھے مڑ کر ان کا شعار ہو، معاشرہ کا کوئی فرد رائیگاں نہ کے باعث اضحلال و کمزوری نہ آنے پائے۔ غیر وہ توازن اور وزن قائم نہیں ہو سکتا جس کی اصل ہوتا آیا ہے۔

ت میں پروان چڑھ سکتی ہے جب ہمارے پیش کو ہوا اور مسلک و مشرب سے بلند ہو کر سوچنے کی سیم کا عمل ہمیں نیم جاں کر چکا اور دوسری طرف پہلے ہی کتنی قیامتیں ہم پر ٹوٹ چکیں۔

مومنانہ فراست کہتے ہیں اور جس سے خوف دلاتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ مومن کی فراست خدا کے نور سے دیکھتی ہے۔

بڑھی میڈیا چراغ مصطفوی کی لو کو بجھانے یا کم از کم مدھم کرنے میں طلوع اسلام کے وقت سے اس کے تعاقب میں ہے۔ عالم کے نئے نظام نے اس کو مزید پر پرزے فراہم کر دئے ہیں۔ مسلمانوں کیلئے یہ ایک چیلنج ہے کہ وہ اس سیلاب کا مقابلہ کس طرح اور کیونکر کریں۔ نیز یہ ثابت کر دکھائیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور سچا مذہب ہے۔

باری ہے۔ اس پر ہم اپنی ناقص رائے پیش کر ل کرنا نہیں چاہتے۔ اس سے میڈیا کی کرشمہ بازی اور رائی کا پر بت بنا دینے میں مہارت (Eth) کا یہ عالم ہے کہ وہ شہستانوں کے موضوع بنا دیتا ہے اور ڈانٹا جیسی خاتون کا بھی ہے۔ لیکن عمر انہ کیس کئی جہتوں سے مختلف اور سماندہ علاقہ کی ایک خاتون کا نام نہیں رہا بلکہ وہ میں پیش کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہر حال اسے کامیابی ملی ہے کہ نعوذ باللہ اسلام مانے کے دوش بدوش چلنے کی صلاحیت نہیں اپنوں سے زیادہ شکایت ہے، اغیار کا ہدف ہے۔ وہ اسلام جو ایک مکمل نظام حیات ہے کہ دنیا کی ساری تہذیبیں ان میں جذب اور کے ساتھ باقی رہنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے Rit سے کوئی سروکار نہیں وہ تو چاہتے ہیں کہ دی جائے۔ اور چشمہ صافی سے انہیں جس ن کے باہمی اختلافات کو ہوا دی جائے۔ اپنوں سے شکوہ ہے کہ انہوں نے اختلافات کو چوراہوں پر لے آنے میں سستی شہرت کی میں کیا، علاوہ ازیں ہم اس پر بھی شکوہ سنج ہیں کم کرتے ہوئے سانپ کے گزر جانے کے بعد بیالے کر اس فراست کی تلاش میں رہے جسے

خدا پرستی، امن پسندی اور اعتدال کی روش اور اس کے بالمقابل کہاں بنیاد پرستی، دہشت گردی اور انتہا پسندی کی اصطلاحات!! لیکن بغض و عداوت کی چالیں بہت باریک ہوتی ہیں۔ چنانچہ بنیاد پرستی کے سوتوں اور ان کے سرچشموں کو ڈھونڈنے کا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا رہا، ان کی تلاش میں ان کی انگلیاں سیال سونے کے چشموں، بیداری کے نغموں، غیرت و حمیت کے زمزموں پر بھی اٹھیں اور ستم بالائے ستم مدارس کے نصاب میں بھی ان کی باریک بین نگاہوں کو وہ جرثومے دکھائی دینے لگے جو اس کے پڑھنے والے کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ اور ایسے بہت سے 'حرف غلط' ہیں جو بیمار ذہنیت کی اختراع اور اپنے ناپاک منصوبوں کو وجہ جواز بخشنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی تدابیر ہیں۔ بے چاری امت کو اطمینان ہے تو اس بات کا کہ بے بنیاد الزام تراشی کا یہ ایک ایسا تسلسل ہے جس کا سرا انبیاء و رسل سے جاملتا ہے قرآن کو اسی دیتا ہے کہ (اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انہوں نے کہہ دیا کہ یہ ساحر ہے یا دیوانہ ہے۔ سورۃ الذریت ۵۲)

استعمار کی موجودہ آندھی کے مقابلہ کے لئے شعور کی ضرورت ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں تو ایک چیونٹی کے بھی باشعور ہونے کا پتہ چلتا ہے جس نے لشکر سلیمانؑ کو دیکھ کر چیونٹیوں سے کہا تھا کہ اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں روند ڈالے لیکن وہ تو حضرت سلیمانؑ تھے کہ جن کے خدا ترس دل میں چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی بھی گفتگو سن کر شکر گزاری کا احساس پیدا ہوا کہ اللہ نے مجھ پر انعام فرمایا ہے (النمل: ۱۹) لیکن ہمیں استعمار کے جس لاؤ لشکر کا سامنا ہے اس کا معاملہ بے خبری کا نہیں بلکہ پوری طرح سے باخبری کا ہے۔ اس پر نشہ اس لئے بھی سوار ہے کہ اس نے فطرت پر اپنے اخلاقی ظرف سے زیادہ قابو پالیا ہے اور افسوس کہ وہ اپنی طاقت و قوت کو زندگی کی فراوانی کے لئے استعمال نہیں کر رہا بلکہ انسانیت کو تباہ و برباد کرنے کا درپے آزار ہے۔

مسئلہ کا حل یہ ہے کہ روحانی و مادی زندگی میں مفاہمت اور توازن پیدا ہو اور یہ کام اسی

## حرف غلط کا پرچار

ایک بار لکھا تھا کہ کمپوز شدہ صفحات سے املا کی سے جوئیں چنی جائیں اب خیال آتا ہے کہ یہ پروف پڑھنے سے (جس میں راقم بھی مبتلا نہ اسے یوں کہنے کی اجازت دی جائے کہ چیونٹیاں پڑ گئی ہوں۔ مثالیں مختلف لیکن کام اس کا بار ہونا اور ناگوار گزرنا دونوں تسلیم وار چیزیں زندگی میں ناگزیر بن جاتی ہیں یہ تو طلیں آسان ہوتی رہتی ہیں مثلاً بات چلی تھی یی مقدرتو یہ ہے کہ وہ مٹا کر رکھ دیا جائے۔

انے والے حرف غلط کی جسے آپ کا تب کے دنیا نے دیدہ و دانستہ بہت سے، "حرف وہ انہیں صحیح قرار دینے اور صحیح منوالینے پر تلی ہوتا ہے اور مدت مدید کے بعد وہ اپنے معانی کا لفظ کسی زمانہ میں علم و فضل میں کمال کی س سے تحقیر و اہانت کی بو آتی ہے۔ ادھر چند ایسی اصطلاحات وضع ہوئیں اور انہیں خوب ن میں بعد المشر قین پایا جاتا ہے۔ مثلاً کہاں

## سیاست کا منفی رخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری

کسی بھی معاشرہ اور ملک میں چند مقامات ایسے ہوا کرتے ہیں جن کے متعلق بجا طور پر یہ رائے رکھی جاتی ہے کہ یہاں مسلک و مشرب، مذہب و ملت، ذات و پات، ذاتی اختلافات، تحفظات اور سیاست سے بلند ہو کر پیش آنے والے حالات و واقعات، مسائل و مشکلات کا سنجیدگی و دیانت داری کیساتھ جائزہ لیا جاسکے۔ کھلے ذہن کے ساتھ بحث و مباحثہ ہو، ظاہر ہے کہ بحث و مباحثہ میں مختلف آراء سامنے آئیں گی اور اختلاف رائے کا اظہار ہوگا، اگر بحث و مباحثہ کسی مفید و مثبت نتیجہ پر ختم کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اختلاف رائے کو مخالفت کا رنگ نہ دیا جائے۔

تقدس و وقار کے حامل اداروں یا مقامات کی فہرست میں پارلیمنٹ، یونیورسٹیز، اسمبلیوں، دینی دانش گاہوں، دینی ملی و قومی تحریکات وغیرہ کو شامل کیا جاسکتا ہے، ان اداروں کے ذریعہ کسی تعمیری رخ کو اپنانے جانے کی توقع اسی صورت میں کی جاسکتی ہے جب ان اداروں یا ایوانوں میں ذاتی مفادات، اختلاف برائے اختلاف سے بلند ہو کر تعمیری ذہن اور الجھے ہوئے مسئلہ کو سلجھانے کے پاک ارادہ اور نیک نیتی کے ساتھ بحث کی جائے ورنہ بات نشست، گفتگو اور برخاستگی سے آگے نہیں بڑھے گی، بات صرف اس حد تک رہے تو بھی گوارا ہے لیکن افسوس ”ہنگامہ آرائی پہ موقوف ہے گھر کی رونق“ سے بھی بات آگے بڑھ جاتی ہے اور ان اداروں یا ایوانوں میں وہ سیاست درآتی ہے جو تعمیری نہیں تخریبی ہوتی ہے اور جو صحت مندانہ نہیں بیمار ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔

نفس مسئلہ پر کھلی بحث کیلئے ادارے یا ایوان اسلئے بھی راضی نہیں ہو پاتے کہ ان کے سامنے مصلحتیں ہوتی ہیں اور وہ اپنی مصلحتوں کو ملک و قوم کے مفاد پر ترجیح نہیں دے سکتے

ہا گیا ہے۔ غصہ، جذبات اور رد عمل سے اپنے شدہ کی تلاش و جستجو اور حصول کی ضرورت ہے اور پروپیگنڈے از خود کا فور ہو جائیں گے، اور ناکام و نامراد رہے گا اور اسلام کی صحیح اور سچی

یقہ کار کو اپنانے کی ضرورت ہے نہ کہ غلط اور اظہار کی۔



## جمہوریت کی بے بسی

ابراہام لنکن نے جمہوریت کی جو تعریف (Definition) کی ہے اس سے اسکول کا ایک عام طالب علم بھی واقف ہے۔

Democracy is the govt. of the people for the people and by the people.

”جمہوریت یعنی عوام کی حکومت، عوام کے لئے اور عوام کے ذریعہ“ مذکورہ تعریف تھیوری اور نظریہ کے لحاظ سے تو بڑی خوش کن ہے لیکن عمل کی تجربہ گاہ میں اس قدر حیران کن ثابت ہوئی ہے، کہ سیاسیات کے ایک دل جلے طالب علم نے ابراہام لنکن کی روح سے معذرت کے ساتھ جمہوریت کی تعریف کچھ یوں کی:

Democracy is the govt. off the people, far the people, and buy the people.

لیکن جمہوریت پر کچھ لکھنے سے قبل اس کی اس خوبی کا اعتراف تو کر ہی لینا چاہیئے کہ اس میں اظہار رائے کی آزادی تو ہے ہی!..... مثلاً یاد آتا ہے کہ حصول آزادی کے چند برسوں بعد ہی ایک معروف قلم کار نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں لکھا تھا کہ ہندوستانی عوام ابھی جمہوریت کی متحمل نہیں ہوئی، راقم سطور ان کی روح سے معذرت کیساتھ عرض کرنا چاہے گا کہ ہندوستانی عوام تو نہیں البتہ اس کے لیڈر اور نیتا اس کے متحمل نہیں، یہ تو بات ہوئی ایک قلم کار کی جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ سوچتا رہے اور لکھتا رہے لیکن اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوری طرز حکومت کو ان لوگوں

نے بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسی میں ان کا مفاد اقتدار یا کرسی تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں مانع بنتے ہیں کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ کسی مسئلہ کی گتھی کو سلجھانے کیلئے خود کو آمادہ کر سکیں۔

بمان کے ایوان (جو قانون ساز بھی ہیں اور جس جس ہنگامہ آرائی، الزام تراشی، اختلاف کو ہیں وہ افسوسناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے مال ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور لاکھوں رائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

ملتا ہے جب سماج میں ایسے ریفارم پیدا ہوں اور اقتدار کی ہوس سے وہ بلند ہوں نیز ان کا نہ صرف عوامی شعور کو بیدار کر سکیں اور ذہنوں تدار بھی ان کے وجود، ان کی خدمات اور ان کے بیہ میں کسی مسئلہ میں ان کی رائے سے حکومت ایسی شخصیت ملک میں نہیں رہی وہ ایک ایسی نہ اور منزل نہ اقتدار تھا اور نہ صاحبان اقتدار

نیز دانشور طبقہ کی سرکردہ شخصیات ایک پلیٹ کھ کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کر سکتی ہیں جو ایوانوں، عمل پر اثر انداز ہو سکے ورنہ محض ایسی سیاسی آتی جن کے پیش نظر متنازعہ ایشوز ہوتے ہیں وجود کے باقی رہنے کے ضامن ہوتے ہیں۔

پسندی کے لئے تو گنجائش ہے بلکہ مطلوب ہے لیکن اس میں شخصیت پرستی کے لئے تو کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔

بدعنوانیوں کے جتنے عنوان ہو سکتے ہیں وہ سب پنپ رہے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ جنم پار ہے ہیں، رفیع احمد قدوائی اور لال بہادر شاستری جیسی اصل پسند شخصیتوں کو دیکھنے کے لئے اب آنکھیں ترستی ہیں اب تو سیاست کا سب سے بڑا اصول ”بے اصولی“ ہی ہے اور بے اصولی کی گرم بازاری کے ماحول میں میدان سیاست میں کسی اصول پسند کا گزر بھی ممکن نہیں دکھائی دیتا۔

افسوس کہ تربیت یافتہ جنون جوان ہوتا جا رہا ہے اور اس جنون کو خرد قرار دیا جا رہا ہے جس وقت اس ملک کا ڈھانچہ جمہوری قرار دیا جا رہا ہوگا، اس وقت ان قائدین کو شاید گمان بھی نہ گزرا ہو کہ کثرت میں وحدت (Unity in Diversity) کے بجائے ایک مخصوص رنگ میں رنگ دینے کی کوشش رنگ لائیں گی اور یہ دن دکھائیں گی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ عوام کی جذبات سے کھیل کر جمہوریت کی سواری پر بیٹھ کر سنگھاس تک پہنچنے کی راہ ہموار ہوگی!!۔

چنانچہ ہر حساس و باضمیر شہری محسوس کرتا ہے کہ جمہوریت مظلوم ہے اور جمہوریت کے نام پر اقتدار کرنے والوں کے ہاتھوں اس استحصال ہو رہا ہے..... جمہوریت تو بس آڑ کی ٹٹی ہو کر رہ گئی ہے جس کے پس پشت اپنے مفادات، اپنے منصوبوں اور اپنے عزائم کی تکمیل کی راہیں استوار کی جا رہی ہیں۔

بظاہر یہ جمہوریت کی بے بسی اور جمہوری نظام کی بچا رگی ہے لیکن ہے کوئی جو اس پر بھی غور کرے کہ یہ محض جمہوریت اور جمہوری نظام کی نہیں بلکہ عقل انسانی ہی کو تو اختراع ہے اور رہی عقل انسانی تو اس کے ناقص و خام ہونے اور اس کے ناکام و نامراد رہنے کا تجربہ درخ کہن نے ایک بار نہیں، بار بار کیا ہے!!!۔

ملاڑی ہیں۔

ناکامی کے سوال کا جواب سر دست ہم نہ تو دانوں کے بیانات میں۔ یوم جمہوریہ کے جمہوریت..... جمہور کی طمانیت اور عوام

ہر حصہ میں کیا آیا؟ یہ موضوع تو ریسرچ میں ایک عام آدمی یہ جانتا ہے کہ ملک کی ایک م ہے اس لحاظ سے عوام کو کیا ملا؟..... پر

جمہوریت اپنی نوعیت کا ایسا متفرد پھل ثابت ہے لیکن لیڈروں کے لئے نہایت میٹھا اور کرنے کے لئے لیڈروں کی عقل عیار نے..... روزی روٹی سے لے کر دین دھرم تک اعمال کرنے اور لاشوں سے گزر کر ایوانوں تک کو لالچ لٹکا کا احساس تک نہیں ہوتا!

لحاظ سے جمہوریت کا چہرہ بظاہر کتنا ہی حسین م اور لہو لہو ہے..... جمہوری نظام میں عوام نوٹ کے بل پر اور بندوق کی نوک پر حاصل

والوں کی تانا شاہی بس دیکھتے ہی بنتی ہے قی بالکل دوسری چیز، جمہوریت میں شخصیت

رہنے کا اہل سمجھا جاؤں!! اللہ نہ کرے کہ اس کا جواب نفی میں ہو مگر اب اسے کیا کہئے کہ صورت حال اس سے مختلف ہی تو ہے!!۔۔۔۔۔ اس کی وجہ تلاش کیجئے تو وجہ بھی صاف اور سیدھی ہے کہ ہم دوسری قوموں اور تہذیبوں کے مدعو بن گئے ہیں۔ اس حال میں مثالی اسلامی بستی کی بات دیوانہ کا خواب نہ معلوم ہو تو اور کیا ہو!!

ماشاء اللہ اس ملک میں بہت سی دینی اور اسلامی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں، سب کا کام مستحسن اور قابل قدر۔۔۔۔۔ مثالی اسلامی بستی کا قیام اول مرحلہ میں ذہن سازی چاہتا ہے، تسلیم!! دینی شعور کی بیداری چاہتا ہے۔ تسلیم!! مگر ان سب کے باوجود یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کاش! دین کا کام کرنے والے فرزانوں میں کوئی ایسا دیوانہ بھی سامنے آئے جو ایک ایسی مثالی بستی کو بسانے کا عملی تجربہ کرنے کی ہمت کرے جہاں کا ماحول پاکیزہ اور جہاں کی فضا نورانی ہو!!۔۔۔۔۔ آج جگہ جگہ تعمیرات کا ایک سلسلہ جاری ہے جو جنگل میں منگل کا سماں پیش کر رہا ہے کاش کہ ان تعمیرات میں کوئی تعمیر ایسی بھی ہو جس میں مذکورہ تعمیر روش بھی کارفرما ہو!! کام مشکل ضرور ہے لیکن کرنے کا ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک چیلنج ہے جسے قبول کرنا چاہئے۔۔۔۔۔ ہے کوئی جو اس جو کھم کا بیڑا اٹھائے اور سماج کے غرق ہوتے بیڑے کو غرق ہونے سے بچانے کا کام کر جائے! امن و سکون کی متلاشی دنیا ایسے دیوانہ کی منتظر ہے!!!

## بستی کا قیام

بول کیجئے!

فرمایا اور نہایت نہایت درد و کرب کے ساتھ واشکالات کرے، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے اور وہ بھی اطمینان بخش اور تسلی بخش جواب دے رہے جس کا جواب بنائے نہیں بنتا۔۔۔ وہ نکامات اسلامی پر پوری طرح عامل سماج آخر فی السلم کافۃ اسلام میں پورے کے ہاں ملک یا صوبہ یا شہر بلکہ محلہ ہی جو اس احکام کی بستی کہ جب اس میں اپنے بچپن کی بستی کی بچپن تو ان کی آنکھیں کھل جائیں کہ رب کی سے کہتے ہیں!!!

بہ، شہر، گاؤں یا محلہ کی بات تو بعد میں کیجئے پر غور کریں اور خود اپنے آپ سے پوچھیں کہ گھر ہی ایسا ہے جسے اسلامی اور مثالی کہا ہے ہٹے اور خود اپنے آپ سے پوچھئے کہ ان کی ہو تو کیا میں اس لائق ہوں کہ ایسی بستی میں

سرکارِ دوعالم ﷺ کی توہین کی گئی تھی اس لیے اس پر مسلمانوں کا احتجاج کرنا اور مشتعل ہونا بجا ہے مگر سوال یہ ہے کہ احتجاج اور اشتعال کا نتیجہ کیا ہوا ایک نتیجہ تو صاف اور نمایاں طور سے سامنے ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی سازش کامیاب ہو گئی اور ساری دنیا میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا، مسلمان سرکوں پر نکل آئے ”بش“ اور دوسری ناپسندیدہ شخصیتوں کے پتلے نذرِ آتش کیے گئے، نیتاؤں اور افسوس کہ مسلم لیڈروں نے بھی اس پر اپنی روٹیاں سینگیں اور ووٹ بینک کے لئے سیاسی پارٹیوں نے اس احتجاج کی آواز میں آواز ملائے کے موقع کو غنیمت سمجھا ”بش“ دندناتے ہوئے پھر رہے ہیں، کارٹونیٹ پر قتل کا فتویٰ اسے اسی طرح نفع پہنچائے گا جس طرح سلمان رشدی کو علامہ خمینیؒ کے فتویٰ نے پہنچایا تھا اور سلمان رشدی کی عزت افزائی نیز اس کی سیکورٹی میں اضافہ ہو گیا علمی سطح پر میری اپنی معلومات کے مطابق صرف ایک مسلم دانشور ڈاکٹر رفیق زکریا مرحوم نے رشدی کی کتاب کا مدلل، علمی اور اعلیٰ پیمانہ پر جواب دیا تھا۔ یہ وقت بھی جب کہ ہم فکری دہشت گردی کا شکار ہیں، قانونی اور فکری سطح پر ہی مدلل، علمی اور اعلیٰ پیمانہ پر ایسی تمسخر آمیز حرکتوں کا جواب دینے کی ضرورت تھی اور عالمی سطح کے مذہبی دانشوروں کو جمع کرنے، ان کے ساتھ مل بیٹھ کر اس حساس مذہبی مسئلہ کو حل کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک عیسائی ملک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نعوذ باللہ مذاق اڑایا گیا مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا عیسائی حیرت زدہ رہ گئے کہ یہ تو ہمارے کرنے کا کام تھا، لیکن جب یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ مسلمان بھی حضرت عیسیٰ کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں، مذہبی مسئلہ کو مذہبی پلیٹ فارم پر حل کرنے کی ضرورت ہے مذاہبِ عالم کا مسئلہ ایسے مسئلوں کو بنا دینا چاہیئے، دنیا بھر میں مسلمانوں کی جانوں کا اس سلسلہ میں اتلاف ہوا، کتنے مسلمانوں نے سینوں پر گولیاں کھائیں لیکن دشمن کا کیا بگڑا؟ ہاں! احتجاج میں بے قصور لوگوں کی دکانوں کو کسی حد تک نقصان پہنچایا لیکن یہ بھی اسلام میں کہاں جائز ہے کہ جو جرم نہ کرے اسے جرم کی سزا دی جائے دشمن جانتا ہے کہ مسلمانوں میں شعلے بھڑکانے کے لئے صرف ایک چنگاری کافی ہے تسلیمہ نسرین یا شبلی نامی خاتون اور

## نیت اور سہل انگاری

ہمارے شیفتگی ہمارا جزو ایمان ہے آپ کا تقدس ہی متاعِ عزیز ہے اور دشمن اس نزاکت کو نہ حساسیت کی وجہ سے مختلف سازشیں بھی رچتا اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے رشتہ کو کے عقیدہ میں تشکیک کے جراثیم داخل کر دینے بے رشتہ منقطع کیا گیا اور مستشرقین مدتوں سے ہیں۔

ناسیت ہے اور دوسری طرف اغیار کا اس منظم مسلمان یوں بھی جذباتی واقع ہوا ہے اور اس کی اس جذباتیت کے نتیجے میں مسلمانوں نے نہ ٹوں سے گزرے، اغیار اس بات کو اچھی طرح INFLAM ٹنکی کی طرح ہے جس سے آگ ایک جلتی ہوئی تیلی دکھا دینا ہی کافی ہے۔

ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں بنایا گیا ہو اور کیا اور پھر اس کے بعد اس کارٹون کی نقل اسی میں برابر شائع ہوتے رہے اس کارٹون میں

اور اس طرح کی سازشوں کی ایک لمبی فہرست  
 زک نیز عقیدہ و ایمان کے خلاف منصوبہ بند  
 عیار دماغوں کی کارستانیوں اور پھر میڈیا کے  
 ف کیا ہو یہ جذباتی اور حساس مسئلہ ضرور ہے  
 یہ نہ سمجھا کہ یہ ہماری نزاکت اور حساسیت اور  
 ہے ہیں تو آنے والی نسلوں کے سامنے ہمیں  
 کے لیے علماء اور دانشوروں کو سر جوڑ کر بیٹھنا  
 کئے رہتی ہیں، مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر  
 یہ تہ کہ دشمن کا یہ کھیل کامیاب نہ ہونے پائے  
 کے اکثر و بیشتر مسائل کا جائزہ لیجئے تو وہ  
 جبکہ دشمن سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان،  
 کی تفرقہ پروری کو ہوا دیکر باسانی اپنے مسلم  
 کہ وہ امت جس کو امت وسط کہا گیا، جس کو  
 کو سلجھانے کی خود آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 ہلا کر محض جوش و جذبہ میں اپنی جان گنوا دے  
 لگ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ناموس  
 پھانور ہیں، وہ ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز  
 سازشوں کے نت نئے روپ اور ہتھکنڈے  
 نے اور منصوبہ بندی، حکمت عملی و باریک بینی  
 لم کیا تھا بقول امام ذہبی کہ آپ سے بڑھ کر عفو  
 کی جاسکتی جس قدر آپ کی ذات گرامی میں  
 پر پکارتے یا بے ادبی کی بات کہہ جاتے، کبھی

براہ راست ذات گرامی کو برے لفظ سے یاد کرتے، ان سب پر آپ صبر کرتے اور کسی انتقام  
 کی ذرہ برابر خواہش نہیں رکھتے، اس لئے بھی کہ آپ کو اس بات کا یقین تھا کہ اسلام کو اللہ  
 تعالیٰ تمام مذاہب پر غلبہ عطا کرے گا۔

گستاخی معاف! یہاں پہنچ کر میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ مسلمان از خود عملی  
 طور پر تعلیمات اسلامی کا کتنا احترام کرتا ہے مسجدیں مرثیہ خواں ہے، چہرے بے نور ہیں،  
 پانجامہ ٹخنوں سے نیچے جارہا ہے ایک کارٹون پر ہم چراغ پا ہوئے اور بجا طور پر ہوئے لیکن  
 مغرب سے عیاشی و فحاشی اور عریانی کا جو سیلاب بلا چلا ہے وہ نہ صرف ہمارے دروازوں  
 پر دستک دے رہا ہے بلکہ ہمارے گھروں میں داخل ہو چکا ہے اور خاکم بدہن کہیں ایسا نہ ہو  
 کہ مغرب کا یہ بڑھتا ہوا طوفان مسلمانوں کی حس ہی کو ختم کر دے اور گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھیں  
 اس صورت میں ہر مسلمان خود ایک کارٹون بن جائے گا، اسلام کی جڑوں پر تیشہ چلایا جا رہا  
 ہے اور ہم اس سے غافل ہیں، یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام خطرے میں نہیں ہے وہ  
 آسمانی سانچہ ہے اس کی حفاظت خود اللہ کرے گا لیکن مسلمان ضرور خطرے میں ہیں اور  
 اسلئے خطرے میں ہیں کہ وہ خود اپنے آپ سے پوچھیں کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

سنگاپور کے ایک بچی صاحب میرے پاس آئے تھے وہاں یونین احتجاج، جلوس  
 وغیرہ پر برسوں سے پابندی ہے وہاں کے منتظم اعلیٰ نے فوراً فیصلہ کیا کہ تمام یورپین  
 اخبارات پر سنگاپور میں Ban لگا دیا جائے، پابندی لگ گئی مسلمان بھی مطمئن ہیں نہ کوئی  
 شور شرابہ یا کوئی احتجاج و جلوس! بعض باتوں کی جڑوں کو کاٹ کر ان کو اہمیت نہ دینا ہی  
 حکمت عملی ہوتی ہے اور وہ دشمن کی سازشوں پر پانی پھیر دیتی ہے اور بے چارہ اپنا سامنہ  
 لے کر رہ جاتا ہے اور ہیرو بننے کا خواہش مند زیر و بن جاتا ہے یہ تدبیر بھی غور طلب ہے۔

جب اس پر اخلاقی و انسانی قدروں کی گرفت باقی نہ رہے پھر ایسا طاقتور کمزوروں کو سہارا دینے کے بجائے انہیں ستاتا ہے، پیار کی شبنم چھڑکنے کے بجائے نفرت کی آگ بھڑکاتا ہے، اور یہی عمل ظلم کہلاتا ہے، ظلم کی تاریخ بتاتی ہے کہ مظلوم طبقہ ظلم کی چکی میں پستار ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق مظلوم بے سروسامانی کے عالم میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر ظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ظلم کا رد عمل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ظلم و نا انصافی اور حق تلفی کو دہشت گردی کی بنیاد قرار دینا غلط نہیں ہوگا، اس لئے جب تک ظلم و نا انصافی اور حق تلفی کے خاتمہ کی کوشش نہیں ہوتی اس وقت تک دہشت گردی کے خاتمہ کی تدابیر موثر و نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔

علاوہ ازیں جب کسی طبقہ میں احساس مظلومیت پیدا ہوتا ہے تو طبعی طور پر اس کی نفسیات ظالم سے نفرت کی نفسیات بن جاتی ہے اور ظالم و مظلوم کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ اس خلیج کو پائنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں اگر طاقتور محبت کا ہاتھ بڑھانے میں پہل کرے، کمزوروں کو خوف و ذلت کی نفسیات میں مبتلا کرنے کے بجائے ان کے ساتھ محبت و الفت سے کام لے، ان کے زخموں پر مرہم رکھے تو ایسی کوششیں مظلوموں اور کمزوروں کے دلوں کو جیتنے کی راہیں ہموار کریں گی، دوریاں مٹیں گی اور فاصلے گھٹیں گے، حاصل یہ کہ دہشت گردوں کے ہتھیاروں کے مقابلے میں ”محبت فاتح عالم“ کا نسخہ اپنانا ہوگا، محبت فاتح عالم کی شمشیر ایک ایسی شمشیر ہے جو دلوں کو فتح کرتی ہے۔ دہشت گردی کے خاتمہ کا عزم کرنے والوں کو یہ اصول بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

مرہم کاری اور ہمدردی کے نتیجے میں جب دونوں طبقے قریب آئیں گے تو طاقتور کو اپنے عمل اور کمزور کو اپنے رد عمل کا غیر جذباتی انداز میں جائزہ لینے کی توفیق ملے گی، طاقتور اور کمزور دونوں طبقات کی اپنی اپنی خود احتسابی کا یہ عمل ان دونوں میں حقیقت پسندی پیدا کرے گا اور جس دن ان دونوں طبقات میں حقیقت پسندی پیدا ہو جائیگی وہ دن دہشت گردی کے خاتمہ کی طرف صحیح رخ اپنانے کا دن ہوگا، حاصل یہ کہ دہشت گردی کے خاتمہ کا

## تمہ کیوں اور کیسے؟

اور اس انداز سے ہو رہا ہے کہ اب اس سے میں ظلم اور مظلومیت کی ایک تاریخ مرتب ہو انسانوں کے خون سے رنگین ہوتی چلی جا رہی گردی کا دواویلا ہے، اس کے سد باب کے لئے اس وقت سب سے بڑا چیلنج دہشت گردی کا ہے اب تک دہشت گردی کی تعریف متعین نہیں ہوئی ہے اور کمزور کے نزدیک کچھ اور کہتا ہے اور دوسری جگہ اسی نوعیت کے عمل کو

مر جائزہ لیا جائے تو اس کی ایک بنیادی وجہ ہو ایک جگہ ایک عمل کو اپنے مفاد اور مقاصد کی بر مری جگہ اسی نوعیت کے عمل کو اپنے مفاد کے معیار ہے، گویا دو ہر معیار اپنانا انصاف کی مطلب ہے ظلم کے راستے پر چل پڑنا۔ جب کے یہ تقسیم ظالم اور مظلوم کی تقسیم ہوگی یا یوں کے طاقت و قوت اس وقت نشہ بن جاتی ہے

## وطن محبوب ہے معبود نہیں

یوپی کی کلیان سنگھ سرکار کے عہد اقتدار میں سرسوتی وندا پڑھے جانے کا سرکلر اسکولوں میں جاری ہوا تھا لیکن احتجاج ہونے پر اس سے کلیان سنگھ سرکار نے نہ صرف معذرت کی تھی بلکہ ایسے کسی اقدام سے گریز کا بھی اعلان کیا تھا حضرت مولانا علی میاں حیات تھے انہوں نے صاف طور سے کہا تھا کہ یہ ہمارے ایمان و عقیدہ کا مسئلہ ہے اگر حکومت اپنے فیصلہ پر اٹل رہی تو ہم اپنے نو نہالوں کو ایسے اسکولوں سے کنارہ کش ہو جانے کیلئے کہہ دیں گے ”وندے ماترم“ کا مسئلہ بھی باسی کڑھی میں ابال کی طرح اکثر و بیشتر سامنے لایا جاتا رہا ہے جبکہ سب جانتے ہیں کہ اس کے مندرجات سے مسلمانوں کے بنیادی عقائد پر ضرب پڑتی ہے، ایک مسلمان کو ایمان اپنی جان و مال سے زیادہ عزیز ہے اور وہ اپنے ایمان کا سودا تو بڑی بات ہے اس پر حرف بھی آنے نہیں دینا چاہتا۔

گزشتہ (۱۴ مئی ۲۰۰۵ء) کے اخبارات میں یہ خبر ہے کہ مہاراشٹر، جہاں کانگریس برسر اقتدار ہے، وہاں سرکلر میں مذہبی اوتار کے ساتھ ساتھ سیاسی مہاتما اور آتما نیں بھی ہیں جن میں ایک نام مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہے جو نہ صرف عظیم مجاہد آزادی تھے بلکہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم بھی تھے، اس کے علاوہ مولانا عالم دین اور ایک مفسر قرآن بھی رہے اس سرکلر سے مولانا کی روح یقیناً شرمسار ہو گئی ہوگی کہ جس ملک کی تقسیم کیلئے وہ آخر تک راضی نہ ہوئے وہاں ان کی نسلوں کو (جن کا بنیادی عقیدہ توحید ہے) سرکاری اسکولوں میں پوجا کے لئے کہا جائے گا اور وہ بھی اس ملک میں جہاں کی

وہمردی و غمگساری سے کام لینے کا طالب مضمی ہے نہ کہ جسموں کو چھلنی کرنے کا۔ جس طرح دہشت گردی کا علاج دہشت گردی نہیں اسی طرح دہشت گردی کا علاج امن پسندی، یہ اپنے آپ سے لڑنے اور خود پر جبر کرنے، ظلم و جور سے عملی نفرت اور حق و انصاف سے کا طالب ہے، بصورت دیگر اندیشہ ہے کہ کوششیں کہیں اس رخ پر نہ پڑ جائیں، جنہیں بیت قرار دے، وقت مرہم بھی ہوتا ہے اور بے گالین ظالموں کے چہروں کو بے نقاب دنیا کو صرف نظر نہیں کرنا چاہئے۔

برشیوں منیوں اور صوفی سنتوں کی سر زمین بیت کے حسین سنگم کا عملی پیغام دنیا کو سنایا نہ کے سلسلہ میں ویسا ہی کردار نبھانا ہے جو اس ان مطابق اور ان کے شایان شان ہو، برگد کو لکد کا رول نبھانا ہے۔ سایہ دار پیڑ کی طرح کہ سب کا من موہ لے!۔ اور ایک بار پھر دنیا کو سنایا جاسکے۔

وں کے گیت میں ہے  
تی پریت میں ہے

## ایک صاحبِ دل طبیب کا نسخہ

جب ہندوستان تقسیم ہوا تو چرخِ کہن نے دیکھا کہ مسلمان کا خون ارزاں ہو گیا ہے نہ اس کی دولت محفوظ ہے نہ عزت، اس کے لئے سراٹھا کر جینا محال اور دو بھر ہے گویا سماج پر ہسٹیر یا کا دورہ پڑ گیا ہے..... انہیں دنوں کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ سے علی گڑھ جانے والی ٹرین کے ڈبے میں ایک برقعہ پوش خاتون داخل ہوئی، ٹرین چلی اور ڈبے میں سوار مسافروں (جنہیں ”شرپسند“ کہنا بیجا نہ ہوگا) کی نگاہ خاتون پر جو پڑی تو ان سب کی زبانیں بھی چلنے لگیں اور جملے کسے جانے لگے۔ اسی ڈبے میں ایک طرف ایک صاحب اور بیٹھے تھے..... چہرے پر داڑھی اور وضع قطع اسلامی... صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ نہ صرف مسلمان ہیں بلکہ سچے اور پکے مسلمان ہیں..... فضا مسموم تھی، ذہن مسموم تھے اس لئے زبانیں بھی زہرا گلنے لگی تھیں..... ان مسافر شرپسندوں میں سے کسی نے جملہ کسا..... ”سفر اچھا کٹ جائے گا، برقع والی ناچے گی اور داڑھی والا گائے گا.....“ یہ سن کر سب کھلکھلا پڑے، ہنسی ٹھٹھا اور تمسخر کے ساتھ ان میں سے ایک شرپسند منچلے نے اسلامی وضع قطع رکھنے والے صاحب سے مخاطب ہو کر کہا ”..... کیوں میاں جی! گانا گانا جانتے ہو؟“ ذرا تصور کیجئے کہ ان جملوں کا نشانہ بننے والے پر کیا بیت رہی ہوگی..... اور اس وقت کیا نقشہ ہوگا..... بظاہر جو تصویر بنتی ہے وہ یہی نا کہ گویا ایک طرف ظلم و آوارگی ہو اور دوسری طرف بے بسی اور بیچارگی ہو!! لیکن نہیں..... ان ”میاں جی“ کی کیفیت ہی کچھ اور تھی..... انہوں نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا..... ”..... ہاں! گانا جانتا تو ہوں لیکن تم لوگ میرا

مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرتا ہے  
مالائی تہذیب کی پرچھائیاں اور جھلکیاں مدہم  
آخری تیر ہے، حکومت اور خصوصاً تعلیم کے  
فیت ختم کر کے اور اسے آلودہ بنا کر وہ نہایت  
زرخ بھی ان کی اس غیر فطری مذموم حرکت کو  
رتا ہے نہ کہ تخریب۔ افسوس کہ شعبہ تعلیم تک  
دیتا اور اس سے تابناک مستقبل خطرہ میں پڑتا  
نوں کی محبت اور وفاداری کی تو اس کی ایک  
روں کا مسئلہ تو ہم نے کل بھی کہا تھا اور آج بھی  
عجوبہ نہیں۔



آج بھی مسلمان ابتلا و آزمائش کے دور سے گزر رہے ہیں اور انہیں تعصب و تنگ نظری کا سامنا ہے، ان حالات میں ان کے لئے اس واقعہ میں بڑا سبق ہے..... دلوں سے دشمنوں کا خوف نکالنے کا ایک ہی نسخہ ہے، آزمودہ نسخہ! کہ دل میں بس خدائے واحد کا خوف پیدا ہو جائے..... ہمارا اصل مرض یہ ہے کہ رب ذوالجلال والا کرام کا خوف دلوں سے نکل گیا ہے اور نتیجہ میں ہر کس و ناکس کا خوف دل میں سا گیا ہے۔

صاحب دل طیب و حکیم افہام اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے اس آزمودہ نسخہ کو (جو اندرون کو بنانے اور دل میں خوفِ خدا کو اتارنے کا نسخہ ہے) اپنا کر ملت آج بھی اپنا علاج کر سکتی ہے اور اپنے درد کا درماں ڈھونڈھ سکتی ہے۔

متنگو بتا رہا تھا کہ کہنے والے کو اس بات پر کمال کے بس میں ہے چنانچہ کیسا خوف اور کیسا ”..... ارے سناؤ تو جانیں.....“ ”میاں“ ”وع کیا..... لیکن ذرا ٹھہریئے، یہ بھی سنئے کہ وہ بھی روایتی نہیں..... مردِ مومن کی ضرب!!

ولا قوۃ الا باللہ..... لا حول ولا قوۃ الا باللہ

وتا شیر کا یہ عالم تھا کہ چند لمحوں میں پہلے جہاں طاری تھا اور اس ہیبت ناک خاموشی میں بس کے نام کی صدا گونج رہی تھی..... ”میاں جی“

ما کہ دل کی انگلیٹھی سے شعلے لپک رہے ہوں، اور ”غارت گر باطل“ کا سماں پیش کر رہے

ہ گیا تھا اور سب سکتے میں آگئے تھے کہ یہ ماجرا

بات ان کے کانوں نے شاید سن رکھی ہو لیکن

پر ”بیت“ بھی رہی تھی۔

بر رہے تھے لیکن وہ اوپر کی سیٹ پر لیٹے ہوئے

بلال اور کمال دیکھا تو نیچے اتر آئے اور بڑے

..... یہ سب نادان لوگ ہیں..... تعصب اور

..... پھر پنڈت جی اس ڈبہ میں سوار مسافروں

ما کہ سن لیا تم نے گانا!..... اب کیوں تمہاری

فتی پڑ گئے؟.....

نہو نہ کے حکیم افہام اللہ صاحب مرحوم، طیبہ کالج

یوہندا و ندوۃ العلماء کی مجلس شوری کے رکن.....

نشانہ نہ تو پردہ ہے اور نہ اسکارف بلکہ اس کے پس پشت جو فلسفہ اور نظام ہے وہ نشانہ پر ہے، مسئلہ اسلام کے نظام حیات کا ہے۔ اس کو ہدف بنانا مقصود ہے چاہے اس کے لئے آڑ پردہ کی لینا پڑے یا اسکارف کی۔

## پردہ پڑ جائے

ایک سیاسی شخص کے ذریعہ آسٹریلیا میں پیش کیا گیا یہ مطالبہ یا یہ تجویز ان دنوں موضوع بحث بنا ہوا ہے وہاں کے سیاست داں، کالم نگار اور دانشور اس مسئلہ پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ اس تجویز کی مخالفت بھی ہو رہی ہے اور حمایت بھی، لیکن مخالفت کرنے والوں کا پلڑا بھاری معلوم ہوتا ہے اسلئے کہ ان کی بات میں وزن ہے۔ تصویر کا یہ پہلو خوش آئند ہے کہ ان میں سے ایک صاف گو کالم نگار جان رمسے نے تو نقاب و چادر سے متعلق رکھی گئی اس تجویز پر سارے رجحانات کو بالائے طاق رکھ کر آخری بات کہہ دی کہ یہ بے عقلی تو انسانوں کو بے لباسی تک پہنچا دے گی۔

رہی بات چادر یا نقاب میں دہشت گردوں کے ہتھیار چھپانے کی، تو یہ حرکت پردہ کی حد تک ہی کیوں کر محدود ہو سکتی ہے؟ آسٹریلیا کے قومی اخبارات نے لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ اس قسم کے خطرہ کے پیش نظر تو پھر زن اور پادریوں کے چوغے بھی زیر غور آنے چاہئیں۔

اور وزیر خارجہ ڈاؤنر نے تو ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بات کہی کہ اگر چادر اور نقاب سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو اوور کوٹ اور برساتی کوٹ سے کیوں نہیں ہو سکتا۔ بڑی معقول بات کہی وزیر خارجہ نے اس لئے کہ کسی مخصوص لباس کے پہننے والے کی کسی ذاتی غلطی کو بنیاد بنا کر اس لباس کو ہی ممنوع قرار دے دینا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے، لیکن افسوس کہ آج دنیا کچھ ایسی ہی غلطی کرنے پر اتر آئی ہے کہ کسی مذہب کے ماننے والے کے ذاتی فعل کو اس کا مذہبی فعل قرار دے دیا جائے اور ایک شخصی غلطی کا رشتہ اس کے مذہب سے جوڑ دیا جائے۔

نقاب اور پردہ میں چھپے ہتھیار کی بات کرنا بھی اسی نوعیت کی بات اور اسی ذہنیت کی غماز ہے۔ اور چادر میں چھپے ایسے ہتھیار کو ان آنکھوں ہی کیلئے دیکھ پانا ممکن ہے جن پر تعصب کی عینک لگی ہو اور جو کسی کی دشمنی میں انہیں اس حد تک جانے پر آمادہ کر دے کہ ایک طرف تو انصاف

سے ایک طبقہ کی عقل پہ پردہ پڑا ہوا ہے اب نو سیت کی علامت قرار دیا جاتا رہا لیکن گزشتہ بڑی دُور کی کوڑی لائے اور چادر یا نقاب پر ہتھیار چھپا کر لائے جاسکتے ہیں۔

کوان کے حقوق سے محروم رکھنے کا موجب ریش ہے اور کہاں یہ اندیشے کہ نقاب یا پردہ ہے۔ ایک طرف تو صنف نازک کے ساتھ مجبور بنانے کا دوا دینا کرنے کی روش اور اظہار اس کی نام نہاد روشن خیالی کی باتیں لیکن اب نقاب کے ڈانڈے ملانے کی خرافاتیں اسی کو کہتے ہیں۔ اگرچہ نائل کی اس تجویز کو رد دیا ہے اور وزیر خارجہ الکوٹز ڈاؤنر نے بھی ذہنیت کا ہے۔ آزادی نسواں اور حقوق نسواں درمیان ہتھیار چھپانے کی الزام تراشی کا فسانہ

ع  
جیس بنالیتی ہے

دنیا ان کی ذہنی مفلسی پر قہقہے بھی لگائے!!  
 مخصوص ذہنیت کا سامنا ہے تو یہ گھڑی ان کی  
 حالات میں امت دعوت کو قدرت نے دین  
 میں پیش کرنے اور عملی سطح پر اس کی حقانیت کو  
 مر ہے کہ یا تو حکمت و فراست سے کام لے کر  
 دنیا کو تنگیوں سے وسعت کی طرف بلائیں ورنہ  
 اپنا کر خود اپنے لئے بھی تنگیاں پیدا کر لیں اور  
 دلوں کو کامیاب ہو جانے دیں!!

## چپ بھلی!

معلوم نہیں کہ کس شاعر نے کس کیفیت میں کہا ہوگا کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب  
 پہ آسکتا نہیں یا کس تاثر میں کسی نے یہ شکوہ کیا ہوگا کہ ع  
 دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

خدا جانے ہمارا ایک دوسرا شاعر اس پر کیوں محو حیرت دکھائی دیتا ہے کہ یہ دنیا  
 کیا سے کیا ہو جائے گی اور کبھی کوئی دل جلا آخر کیوں کر شکوہ سنج ہوتا ہے کہ اگر اس کے بس  
 میں ہو تو وہ اپنے ساتھ نو حہ گر کو رکھے، دل کو روئے اور جگر کو پیٹے، اور کبھی کسی ستم رسیدہ کا جی  
 کیوں چاہتا ہے کہ وہ ایسی جگہ چل کر رہے جہاں کوئی نہ ہو۔

کہنے والے کہیں گے کہ یہ باتیں مایوسی کی ہیں۔ افسردگی کی ہیں۔ کوئی اسے  
 شدت احساس یا شدت شعور کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرے گا۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا  
 کہ امید افزا باتیں سامنے لائیے۔ مانا کہ امید پہ دنیا قائم ہے مگر یہ بھی سچ تو ہے کہ حقیقت  
 سے آنکھیں چرا نا جرم ہے! ایک شخص کے بدن پر ورم ہو اور کوئی اسے باور کرائے کہ یہ صحت  
 ہے تو بتائیے یہ امید دلانا ہو یا اسے فریب میں مبتلا کرنا۔ ہم مایوسی کو کفر سمجھتے ہیں لیکن خوش  
 فہمی اور خود فریبی کو بھی زہر ہلا ہل قرار دیتے ہیں حقیقت پسندی اصل ہے لیکن اب اسے کیا  
 کہئے کہ حقیقت کا اعتراف بھی حوصلہ چاہتا ہے، ہمت و جرأت چاہتا ہے، حقیقت پسندی وہ  
 قدیل ہے جو مایوسی کے اندھیروں میں راستے کی تلاش و جستجو کو آسان بناتی ہے، حقیقت  
 پسندی وہ شاہراہ ہے جس کی منزل انصاف ہے۔ صحیح صورت حال کا ادراک و شعور حقیقت  
 پسندی کے بغیر ممکن نہیں، حقیقت پسندی کا شعور ہی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کا حوصلہ بھی

ماتنی ہے کہ حقیقت پسندی کی راہ کانٹوں بھری  
رسائے جاتے، پتھر برسائے جاتے ہیں۔

کچھ اصولوں کی طالب ہے، حقیقت پسندی  
نی ہو اور اصلاح اس کے پیش نظر ہو۔ اخلاص  
ماری حقیقت پسندی، حقیقت پسندی نہیں شر  
ہو بلکہ خیر کا جذبہ ہی کا فرما ہو لیکن خدا نخواستہ  
سے چھوٹ گیا تو پھر وہ حقیقت پسندی اسے  
نس کے اثرات مثبت نہیں بلکہ منفی ہوتے  
میں اعتدال و سلیقہ چاہتا ہے ورنہ بے اعتدالی

لواری کی ہے اگر اس میں اس کے اصول برتے  
حرف باطل کی طرح مٹ جائے گا اور خدا  
ی اور بے اعتدالی نے راہ پالی تو اس ”حقیقت  
ئے گا۔۔۔ جہاں آوا کا آوا بگڑا ہوا ہو وہاں  
یسی ماحول میں تو چپ ہی بھلی اور (من سکت  
رشاد پر عمل آوری ہی اچھی!

بوجھ وہی ہے

## کاندھے بدل گئے ہیں

مادر وطن کی آزادی کے لئے جیالوں کی جاں فروشی اور قربانی کو یاد کرنے کا مہینہ  
اگست ہے۔ برطانوی سامراج کو غور تھا کہ اس کی حدود سلطنت میں سورج غروب نہیں  
ہوتا لیکن انقلابات زمانہ کہ آج وہی یورپ سپر پاور امریکہ کا حلیف بنا ہوا ہے، کل اقتدار  
کے نشہ میں برطانوی سامراج اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا تھا، آج امریکی سامراج اس سچ  
سے چشم پوشی کر رہا ہے!۔ مگر قانون فطرت تو اپنا کام کرتا رہتا ہے اور (تلك الايام  
ندا ولها بين الناس) کا اطلاق ہوتا رہتا ہے۔ بس عبرت کی آنکھ چاہئے۔۔۔ برطانوی  
سامراج کی قلمرو میں غروب نہ ہونے والا سورج تو دراصل دست قدرت کی وہ روشنی تھی جو  
برطانوی سامراج کے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی، ستم رانی اور الزام تراشی کا تعاقب کر رہی  
تھی۔ بالآخر برطانوی سامراج کے دن بھی پورے ہوئے۔۔۔ برطانوی سامراج کو  
لکارنے والے سرفروش کون تھے؟ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مکمل آزاد سلطنت کا  
ہدف سامنے رکھ کر ایک آگ روشن کی تھی، یہ چنگاری ایسی فروزاں ہوئی کہ سلاسل کا مسکرا کر  
استقبال کرنے والے اور زہر غم کے پیالوں کو قد و نبات کا شربت سمجھ کر پینے والے جیالوں  
کے گروہ کے گروہ سامنے آتے رہے اور منزل آزادی کے ان مسافروں نے وحشت ناک  
ویرانہ میں قدیلین روشن کر دیں۔

اسد بیکل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے  
تو مشق ناز کر، خوں دو عالم میری گردن پر

نہ نکالتی تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا یہ اسوۂ حسنہ کیا تعلیم دیتا ہے؟ یہی تو کہ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاریؒ انہیں پرانے مدرسوں کے تعلیم یافتہ تھے جن پر آج دہشت گردی کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن مولانا کا طرز عمل، ان کے افکار، ان کی وسعت قلبی گویا ان کی پوری زندگی مدارس پر لگائے جانے والے الزامات کی مستقل تردید ہے وہ اپنی تقریروں میں برملا کہتے تھے کہ وطن کی محبت کا نعرہ ہم کسی کی خوشامدیانہ نمود و نمائش کے لئے نہیں بلند کرتے بلکہ یہ ہمارا دین و ایمان ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس ملک کی مثال ایک جسم کی مثال ہے۔ ہمارے ہندو بھائی خود کو شوق سے اس جسم کا دل و دماغ کہہ لیں۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ اگر ناخن کے برابر بھی کسی اقلیت کے سینے میں ذرا بھی پھانس چھبے لگی تو وہ بھی چین و آرام محسوس نہ کریں گے۔ آج پھر مجاہد ملت کی سی جرأت حق کی ضرورت ہے ورنہ الزام تراشیوں کا تو حال یہ ہے کہ

جب کوئی فتنہ زمانہ میں نیا اٹھتا ہے  
تو اشارے سے بتا دیتی ہے تربت میری

نا حفظ الرحمن سیوہاریؒ ہی کو لے لیجئے مولانا  
س آفتاب آزادی طلوع ہوا مگر افسوس کہ اس کا  
سلام قاری محمد طیبؒ ایک شہر سے دوسرے میں  
ب جانے کے لئے بھی خاک و خون میں تڑپتی  
تھی، یہی کا حوصلہ تھا کہ اس قتل و غارت گری کے پر  
ن کی مساعی میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ پارلیمنٹ  
س ہوتا ہے کہ بوجھ وہی ہے البتہ کاندھے بدل  
س زہرا فاشانی کا مسئلہ! فرقہ وارانہ فسادات کا  
نے عزت نفس، خودداری اور وطن پرستی کی  
س قومی زبان کے مسئلہ پر بحث چھڑی ہوئی تھی  
بہیم وار جن کے بجائے رستم و سہراب کا ذکر کیا  
ب دیا تھا کہ اردو زبان کے ہمارے شاعروں  
طیر محسن کا کوروی کا یہ شعر ہے

بلا جانب متھرا بادل  
رتی ہے ہوا لگا جل

ت تک کے ذکر میں اس نے ہندوستانیت کو  
س نے کہا ع

گا جب لا دل چلے گا بنجارہ

ب بنانے والے اس حقیقت کو نظر انداز کئے  
جزء ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ  
نرت فرما رہے تھے تو شہر مکہ کی طرف بار بار  
مکہ! تو مجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے

سائنس لینا نصیب ہو سکتا ہے۔ یہ کام اس امت کے کرنے کا کام ہے جس کے نبی، رحمت عالم ﷺ ہیں اور فتح مکہ کے موقع پر جن کی زبان مبارک سے دنیا نے یہ پیغام سنا تھا کہ آج کا دن بدلہ کا دن نہیں بلکہ ”یومِ رحمت“ ہے۔ آج بھی یہ تاریخ دہرائی جاسکتی ہے بشرطیکہ منظم شرکاء مقابلہ منظم خیر سے کیا جائے اور جدوجہد کی راہ میں وہ اصول اپنائے جائیں جو دینی اخلاقیات کے اصول ہیں۔ ضرورت مستقبلِ بینی اور مستقبلِ بندی کی ہے اور اقبال کے اس مجاہدانہ لب و لہجہ کی کہ ع

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے در ماندہ کارواں کو  
شررفشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ با ر ہوگا

## م خیر سے کیا جائے

ت سب سے بڑا منصف ہے۔ آئے دن پیش  
یہ ہوتی رہتی ہے۔ دنیا بھی ایک اسٹیج کی مانند  
۔ ان ڈراموں کے کردار میں کبھی کوئی ظالم کا  
سا منے آتا ہے۔ ظالم مسکراتا دکھائی دیتا ہے  
و ترس آتا ہے۔ چرخ کہن نے بار بار ایسے  
بھی ظالم کی متکبرانہ مسکراہٹ لیکن اس کی  
س ظالم پر بھی ایسا وقت لا سکتے ہیں کہ جب وہ  
با ہو، ظلم کی چکی بھی عجیب چکی ہے کہ اس کو  
لے بیچ آ کر پس جاتا ہے!! لیکن افسوس کہ اکثر  
لے متعلق سوچنے کی مہلت نہیں دیتی!!

ہی ہے اور اپنا کام کر رہی ہے بلکہ افسوس اس  
ر کی قوتیں منتشر اور غیر مجتمع۔ اگر ظلم و شر کی ایک  
وجود ہیں۔ شر پر غلبہ پانے والے خیر کی تاریخ  
ایسی جدوجہد درکار ہے جو خدا ترسی، احترام  
لوں پر مبنی ہو۔ ان اصولوں پر مبنی جدوجہد ہی  
جس کے نتیجہ میں خلقِ خدا کو راحت و چین کا

مقصود علی خاں صاحب مرحوم سیاست اور صحافت دونوں میدانوں کے نشیب و فراز سے واقف تھے اور بجا طور پر انکو حق تھا کہ وہ تفریحاً ہی سہی کچھ ایسی باتیں کہہ جائیں جو حقیقت پر مبنی ہوں۔ جنوب کے مسلمان کی تعلیم و صنعت اور روزگار و کاروبار میں الحمد للہ نسبتاً بہتر صورت حال ہے جبکہ شمال کے مسلمان کی ذہنیت نعرہ بازی اور عارضی و وقتی ہنگامہ آرائی کی رہی ہے (الامشاء اللہ) جس سے ملت کو نقصان ہی پہنچا ہے تفرقہ پیا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ آنے دیجئے اور پھر دیکھئے کہ ”امت“ کہلانے والی یہ ملت کس ”فراخدی و دیدہ دلیری“ سے انتشار کا مظاہرہ کرتی ہے کہ توبہ ہی بھلی! اپنے تودل مسوس کر رہ جاتے ہیں لیکن ان کی یہ نادانی جگہ ہنسائی کا موجب بنتی ہے اور ان معاملات میں کسی کو صفائی دینا بھی محال ہو جاتا ہے۔

بات نشہ کی چل رہی تھی اور میں کہاں ہوش کی بات کرنے لگا! چنانچہ عرض ہے کہ ایک نشہ ذاتی مفاد کا بھی ہے اور اس قسم کے ذاتی مفاد کا ہے جو اجتماعی مفاد کو نہ صرف قربان کر دے بلکہ بچ کھائے اور چوراہے پر اجتماعی مفاد کی وہ دھجیاں بکھیرے کہ بس اللہ کی پناہ! غالب کو شاید اندازہ تھا کہ یہ جسارت و جرأت دین دھرم کے نام نہاد علمبردار ہی زیادہ دیدہ دلیری اور کمال فریب کاری سے کرتے رہیں گے شاید اسی لئے وہ کہہ گیا۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب  
شرم تم کو مگر نہیں آتی

شاید یہی وجہ بنے اور تاریخ یہ عبرتناک ریکارڈ محفوظ کرے کہ ہندوستان جیسے ملک کی ”دوسری بڑی اکثریت“ اس قدر بڑی تعداد کے باوجود نصف صدی گزر جانے پر بھی اس ملک میں نہ تو اپنا سیاسی وزن محسوس کرا پائی اور نہ تعلیم و کاروبار میں اپنے برادران وطن کے شانہ بشانہ کوئی ممتاز حیثیت حاصل کر سکی۔ رہے اغیار تو انہوں نے اس کی برابر منصوبہ بند کوششیں کیں کہ مسلمانوں کی توانائیاں یا تو ہمارے جنم دئے ہوئے مسائل کے دفاع میں صرف ہو جائیں یا پھر باہمی انتشار میں۔ لیکن آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک موڑ ایسا بھی آیا جب مسلمانوں کے سامنے مرحلہ تحفظ شریعت کا آن پڑا۔ تحفظ شریعت آخری چوکی

## لگے ہیں دیوانے

موسم و سبب ہوں اور غم کے خم لٹائے جا رہے ہوں اور نہ حقیقت حال کے مطابق۔ نشہ تو دولت کا حصول کا بھی ہوتا ہے، خود غرضی و مفاد نمیزی شامل ہو جاتی ہے تو وہ تمام سرحدوں کو س ذاتی مفاد پر بھیٹ چڑھا دیتی ہے۔ جب س بھی پیدا ہونے لگتے ہیں جو ان کے زوال کی ہیں اور جو قومیں اقبال مند ہوتی ہیں، خواہ ان کا بس، جو انہیں دنیوی ترقی پر گامزن رکھتی ہیں۔ س کے پر آشوب حالات پر ہی ایک اچھتی سی لے نیتاؤں کو ان کی قوم کی طرف سے کتنا اعزاز دیا ہی کی ملت کے افراد نے کیا کچھ برا بھلا میں کئے اور شکوک و شبہات کے کون کون سے کے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ ”سالار“ کے سابق ایم پی) سے ایک دن میں نے شمال کی فو انہوں نے بڑا حقیقت پسندانہ جواب عنایت نا جانتے ہیں جبکہ شمال کے لوگوں کی اکثریت بقلم خود دانا وینا اور رہبر و رہنما!!

## بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلتی رہی ہے

سوچتا ہوں لوگ کہتے ہیں کہ بش ظالم ہے اس عاجز کو اس رائے سے سو فیصد اتفاق ہے ہم ان بد نصیبوں میں سے ہیں کہ جن کو اپنے کانوں سے سقوط کا بل اور پھر سقوط بغداد کی دلدوز خبریں سننے کو ملیں اور ہم ان واقعات کو ان معصوم بچوں اور نئی نسلوں کو سنانے کے لئے زندہ ہیں جنہوں نے اب تک اس دنیائے فانی میں آنکھیں نہیں کھولیں!!

بالکل ویسے ہی جیسے ہم نے اپنے آباء و اجداد سے ”چاک کردی ترک ناداں خلافت کی قبا“ کے روح فرسا واقعات سنے ہیں!!

تو اس کا بھرپور اعتراف کہ بش ظالم ہے! لیکن گستاخی معاف ایک سوال اکثر مجھے کچھ کے لگاتا ہے خود اپنے آپ سے اس کا جواب پوچھتا ہوں لیکن مجھے جواب بھائی نہیں دیتا۔

سوچتا ہوں ایک بش ہی کی کیا بات ہے یہاں تو ہر صاحب اقتدار بش بنا بیٹھا ہے!! بش کے ظلم کا دائرہ کار اس لئے وسیع ہے کہ وہ سپر پاور ہے امریکہ کا صدر ہے!

اور ادھر خوش نصیبی کہنے یا بد نصیبی کہہ روس بھی بکھر گیا!!

اور اس طرح اچھا ہوا ہو یا برا کہ دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ گیا!!!

اور امریکہ شتر بے مہار ہو گیا ویٹو کا پاور اسے حاصل!!

سپید کو سیاہ اور سیاہ کو سپید کہنے کا اختیار اس کے پاس!!!

پھر ستم یہ کہ جن کو حق کا علمبردار ہونا چاہئے تھا ان کو ”وہن“ کا گھن لگ گیا حب دنیا

اور کراہیت موت کا گھن!

۲۵۷

لے نام پر متحد نہ ہو پاتا تو وہ اپنی بے حمیتی و بے دلی کو بھی الحمد للہ ۲۸/۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کو منعقد شرکت کی سعادت نصیب ہوئی تھی علماء کا یہ خواب سے کم نہ تھا! ایک حسین خواب!! شیعہ بے فکر کے صف اول کے رہنماؤں کی ڈاکس پر کال کی طرح پڑی ہے جو باقی رہ گئے ہیں چھٹے تو ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ آفتاب میدیہ پہلا موقع تھا کہ اس قدر جوش و جذبہ کے عروج کے عنوان پر جمع تھا اسی موقع پر دیکھا کہ چودھک منڈل کے کرتا دھرتا مسٹر حمید دلوائی کمر جلسہ گاہ کے قریب سے ہی پولیس فورس کی بے مولانا ضیاء الدین بخاری شہید خدا انہیں شہادت سے آگاہ کرنا اور اسے کٹر دل میں بے شعر پڑھا۔

لگے ہیں دیوانے

کیا ہوگا خدا جانے

مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل پر گزر گئے اور مبن کرا بھرا لیکن ”ذرا سی پی کے بہکنے والے پرسنل لاء کے نام پر چند ایک بورڈ قائم کر کے رصادق از بنگال سے نہ کبھی خالی رہی ہے نہ کہ ملت نے ان کو یکسر مسترد کر دیا اور ثبوت دیا اور دینی حمیت کو مزید نکھارا اور ابھارا ہے۔ یہی بے حیات کا کام کرتی رہی ہے۔



میں آئے، ان کا شعار بن گیا اور انہوں نے صورت میں صدر امریکہ کو تو بلا شرکت غیرے

لا گیا ہوں میں کہہ رہا تھا کہ چونکہ امریکہ کے زیادہ ہے!

## میں باز آیا محبت سے.....

مسلم ممالک کو جرأت رندانہ کی ضرورت

ہالینڈ کے شہر ہیگ میں ایک عالمی عدالت انصاف قائم ہے جو بین الاقوامی تنازعات کی سماعت کرتی ہے، اس نے جولائی ۲۰۰۴ء کے پہلے عشرہ میں اپنے ایک فیصلے میں اسرائیلی باڑ کو گرانے اور فلسطینیوں کو ان کے نقصان کا معاوضہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، چونکہ عالمی عدالت انصاف، ہیگ قوت تحقیق نہیں رکھتی اس لئے اس نے اقوام متحدہ (U.N.O) کو ہدایت کی ہے کہ وہ کارروائی کرے۔ اب یہ اقوام متحدہ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سلامتی کونسل کے ذریعہ اس فیصلہ کو نافذ کرائے۔ ساری دنیا نے عالمی عدالت انصاف کے اس فیصلہ کی تحسین کی ہے لیکن امریکہ و اسرائیل نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ امریکہ کے دوہرے معیار کی پالیسی کی جو نظریں ہیں، ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے اس رویہ پر حیرت و استعجاب کی گنجائش ہی نہیں! امریکہ، اسرائیل کی فلسطینیوں کے مقابلے میں جس دیدہ دلیری کے ساتھ پشت پناہی کر رہا ہے اس کی مذمت ایک دنیا کر رہی ہے لیکن امریکہ اور اس کے حلیف برطانیہ کے کانوں پر جوں نہیں ریگتی، متکبر آمرانہ قوتوں کا تو ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے اور رہے گا!

رونا امریکہ و برطانیہ کے رویہ کا نہیں، مسلم دنیا کی بے بسی کا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلم دنیا، عالمی عدالت انصاف، ہیگ کے فیصلے کی تحقیق کا مطالبہ پوری قوت کے ساتھ کرتی تاکہ باڑ کو زمین بوس کیا جاتا اور فلسطینیوں کو ان کا حق مل پاتا!۔

مظلومیت یا تو بے بسی و مایوسی کے اندھیروں میں انسان کو گم کر دیتی ہے یا تو ”یا شیخ

مختار اور چودھری و سردار اپنے اپنے دائرہ سی بش سے کم ہیں؟

مختار کرنے سے چوکتے ہیں؟

کی کو نکلتی رہی ہے اس لئے مسئلہ صرف بش کا ہے چھوٹی مچھلی کا قصور یہ ہے کہ وہ چھوٹی

نہیں پیدا کرتی؟؟؟

سہنے کو بھی تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا مقابلہ میں قوی مومن کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور راعدو الہم ما استطعتم من قوۃ کا ”اور تم ش کرؤ“۔

## جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے...

ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ”خون بہا“ یہ حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی ہے، وہ اقبال کے صحبت یافتہ تھے، وہ تھے تو ڈرامہ نگار لیکن اپنی ذاتی زندگی میں بڑے مذہبی واقع ہوئے تھے، قدرت کی طرف سے حساس طبیعت لے کر آئے تھے، پھر اقبال کی صحبت نے اسے جلا بخشی، سوز و ساز بخشا..... انہیں سفر کرتے رہنے کا بھی شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ پاک پٹن پہونچے وہاں انہوں نے دیکھا کہ پاک پٹن کے مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ ہیں، وہاں کچھ کتب ضرور قائم ہیں، لیکن کوئی جدید طرز کا، ماڈرن انداز کا اسکول نہیں چنانچہ حکیم احمد شجاع نے وہاں فریدیہ اسکول قائم کیا، چونکہ انہوں نے خود علی گڑھ سے علمی استفادہ کیا تھا اس لئے ان کی خواہش ہوئی کہ اپنے قائم کردہ اسکول کو سرسید احمد خاں کے تعلیمی منہج پر چلائیں، اس کا تذکرہ کرنے اور اس سلسلہ میں مشورہ لینے کی غرض سے وہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے، اقبال نے ان کی باتیں غور سے سنیں، پھر آنکھیں موند کر سوچنے لگے تھوڑی دیر بعد گویا ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کہا وہ ایک ”حکیم الامت“ اور ”مرد دانا“ ہی کے کہنے کی چیز تھی۔ اقبال نے کہا ”..... جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ لیکن یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی..... مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ مُلا و درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جیسے ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج

س کو اندھا بنا دیتی ہے یا پھر اس کے برعکس اس کو وا کرتی اور اس کے ضمیر کو خدا اعتمادی دنیا کا ضمیر آج بھی مردہ نہیں ہوا ہے اور حق کو ست کا ہے کہ ایک طرف امریکہ اور اس کے ممالک ہم ہیں جو اپنے ہاتھوں اپنی تصویر بگاڑ لیتے ہیں آرمائش کی گھڑی ہے اور دنیا کی نگاہیں اس سے نکلنے کے لئے کون سا لائحہ عمل اپناتی ہے؟

رسکتا ہے جس کی بدولت امت اسلامیہ کے جانے والی فکر مندی و تشویش کی ظلمتوں میں ہے جب اجتماعی تحفظ و بقا کی فکر ہو اور وقتی بنے اور یہ مزاج غیرت و حمیت کے بغیر نہیں بن سکتے۔ بھانے کا مزاج حاشا و کلا اس بیڑے کی صادق و امین صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ نبی، اپنے مفاد، اور اپنی مصلحت کے لئے جہاز میں نہ تو وہ خود بیچ سکیں گے اور نہ اس جہاز..... ہمارے ایک ہندوستانی شاعر نے اپنے

ع

پا بننے والوں کو بھی چاہیں

ن سے باز آنے کی بات کہتا ہے۔ کیا مسلم دنیا کی یہ جرأت دکھا سکے گی؟ ”میں باز آیا محبت ہ اس قلندرانہ اقدام کے لئے اپنا ذہن بنا سکے

## رقیبوں نے ریٹ لکھوائی ہے۔۔۔۔

شرعی پنچایتوں اور نظام دارالقضاء کو عدالت کے متوازی قرار دینے نیز مسلم خواتین کے ساتھ ہمدردی کے نام پر سپریم کورٹ میں مفاد عامہ کی ایک عرضی داخل کئے جانے اور اس کی بنیاد پر مختلف اداروں کو عدالت کی جانب سے نوٹس جاری کرنے کی اطلاعات سے باخبر قارئین بخوبی واقف ہوں گے، مسئلہ جب عدالت میں ہو تو اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ گنجائش اس لئے کہ عدالت کا احترام پیش نظر ہے اور رہنا چاہئے، البتہ جہاں تک مفاد عامہ کی عرضی کا سوال ہے تو ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ملک و قوم کے سامنے کتنے سارے ایسے مسائل ہیں جو ہماری اخلاقی قدروں، ہماری مذہبی تقدیس و روایات کو نہ صرف مجروح کر رہے ہیں بلکہ وہ سب اس قدر پامال ہوئی جا رہی ہیں کہ سینا و ساوتری کے دلش باسیوں، نایک و چشتی کے نام لیواؤں اور گوتم و اشوک کی عظمت کو تسلیم کرنے والوں کے سر اس وقت شرم سے جھک جاتے ہیں جب وہ اکثر و بیشتر گاندھی و آزاد کی دھرتی پر ایسے بدنما واقعات کو رونما ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جو چیخ کر پکار رہے ہوتے ہیں کہ یہاں کا انسان جب گراؤں پر اترتا ہے تو جانوروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ عوام کا حافظہ ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ وہ تند و روا لے سانحہ کو فراموش کر جائے، سستی کے واقعات اس کے ذہن سے محو ہو جائیں، مدھو میتا کیس کی تلخی کو فراموش کر دے۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا جب جہیز و تلک کی بھینٹ چڑھنے والی بے گناہ عورتوں پر ظلم و ستم کے واقعات ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان زخموں کو ہر آنہ کرتے ہوں، چند ہی برسوں پہلے پیش آنے والے

رووں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش  
اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کے  
نشان نہیں ملے گا.....“

سازشیں اور الزامات اب کسی سے ڈھکے چھپے  
تعلق سے ان کا داویلا اور بے بنیاد الزام  
ادراک ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کی حیثیت  
کس قدر اہم اور بنیادی ہے۔ مدارس جیسے  
نظام، زکوٰۃ کا اجتماعی نظام وغیرہ لیکن رونا اس  
کا جتنا ادراک غیروں کو ہے، اپنوں کو نہیں،

تو سارا جانے ہے

روایتوں کی قدر کرنے کی کہ ان ہی کی ٹوٹی  
یک ملت کی حیثیت سے اپنے تشخص کے

تصور آج بھی دل دہلا دیتا ہے آہ! کیا کچھ نہ  
 پڑی ہوگی امید سے رہی اس خاتون پر جس  
 موم بچے کی زندگی کا چراغ نہایت سفاکی کے  
 ماں کی ماما کو تو ساری دنیا بلا امتیاز مذہب  
 رتی پر کتنی بار اور کتنی آسانی سے کیا گیا اور اس  
 سے لالہ زار بنتی رہی۔ سیاست میں جرائم کی  
 اور عدالت تک نے بھی شدت کے ساتھ  
 کو خود کشی کے سانچے پیش آئے اور یہ احساس  
 شاید کوئی ارزاں چیز نہیں۔ جہاں کی عوام کا  
 موم ہو جہاں کا کسان آتم ہتیا کرنے پر اپنے کو  
 بڑھ رہا ہو اور چند ایک صوبے اس میں بدنامی  
 و دونوں کی اشیاء میں ہی آمیزش اور ملاوٹ نہ  
 کی حفاظت کے نام پر بکنے والی دوائیاں بھی  
 نفت اور کلچر کے نام پر کھلے عام عریانیت اس  
 سٹریز کی وجہ سے شریف انسانوں کا راستہ چلنا  
 دیوالیہ پن کا شکار ہوتی جا رہی ہو اس سے  
 ہی ہیں۔۔۔ غرض ایک دوزخ نہیں سارا جسم  
 آیا بھی تو بیچاری ان شرعی پنچایتوں کا اور ان  
 ہے اور جن کا دائرہ کار نہایت محدود ہے۔ رہی  
 کی غلطی“ ہے کہ ثالث بھلا عدالت کی حیثیت  
 یہ حرکت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اقلیت کو  
 سے دفاع کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنے کیلئے

ہوتا آیا ہے۔۔۔۔ لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ ملت تھک تو سکتی ہے، جھک نہیں سکتی عرضی  
 گزار کو ریٹ Writ داخل کرنا ہی تھا تو کاش وہ مذکورہ بالا حقائق کا ادراک رکھتے اور سمجھتے کہ  
 ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اور نتیجہ میں وہ ایسی ریٹ داخل کرتے جو حقیقت  
 و واقعیت پر مبنی ہوتی، ہزاروں نہیں کروڑوں دلش باسیوں کے دلوں کی آواز و دھڑکن ہوتی  
 اور واقعی وہ ”مفاد عامہ کی ریٹ“ کہلائے جانے کی مستحق قرار پاتی! لیکن یہاں تو شاید نوعیت  
 و کیفیت کچھ ایسی ہی ہے جسے اکبر الہ آبادی بہت پہلے بیان کر چکے  
 رقیبوں نے ریٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں  
 کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اختیار کر لیتے ہیں اور اس صورت میں اختلاف، اختلاف نہیں رہتا بلکہ تنازع بن جاتا ہے۔  
ایک مثال این ڈی اے کی ہے مثال نامناسب ہے لیکن جس امت کی ابتری کا  
عالم ناگفتہ بہ ہو وہ ایسی مثال سے شاید کچھ عبرت پکڑے! بھانت بھانت کی سیاسی پارٹیاں  
ایک دوسرے کے نظریات میں مشرق و مغرب کا بُعد چاہے وہ اقتدار کی ہوس ہی کیوں نہ ہو  
لیکن ان کا بھی ایک مشترکہ پروگرام بن سکتا ہے اور وہ شانہ بشانہ صف آراء ہو سکتے ہیں مگر  
مکمل نظام حیات رکھنے والی یہ امت تحفظ شریعت جیسے مسئلہ پر بھی اتحاد کا مظاہرہ نہیں کر سکتی  
گویا اس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ کبھی متفق نہیں ہوگی۔

کوئے جاناں سے خاک لاتے ہیں

اپنا کعبہ الگ بناتے ہیں

اس پر طرہ یہ کہ روتے ہیں کہ مظلوم ہیں!! اس سے انکار نہیں کہ اغیار اسلام سے  
خوفزدہ ہیں اور وہ ان کے نشانہ پر ہے مگر یہ خارجی مسئلہ ہے اور خارجی مسئلہ اس وقت تک  
قابو میں نہیں آئے گا جب تک ہم داخلی انتشار پر قابو نہ پالیں۔

بناتے ہیں

و بظاہر مظلوم امت معلوم ہوتی ہے لیکن بغور  
س کھڑی دکھائی دیتی ہے جس امت کو کلمہ طیبہ  
کلمہ میں یہ قوت و تاثیر ہو کہ پوری امت کو تو کیا  
ساری مخلوق کنبہ ہے خدا کا، کی عملی تصویر دنیا  
خالص امت نے کلمہ کی بنیاد پر ہی تفرقہ کا آغاز  
امت میں ”امت پنا“ پیدا کرنے کے لئے  
لے کر امت کے ”امت پنے“ کو پنپنے نہ دیا  
کو الجھا کر سرکار رسالت مآب کے سایہ اقدس  
اری آئی جن کی زندگی کا مقصد ہی دین کی  
بہ سلسلہ دراز ہوتا گیا پھر وہ بزرگان دین کہ جن  
ین کیلئے وقف رہا، اشاعت دین میں جنہوں  
ت و خرافات کے دروازے امت نے کھول  
کی گئیں اور امت حلقہ در حلقہ تقسیم ہوتی چلی گئی  
بارہ پارہ اور منتشر۔!! اور ستم بالائے ستم یہ کہ  
ملاقات ہوتے ہیں علمی، فکری، فقہی، نظریاتی  
وقت ہے جب اختلافات مخالفت کا رنگ

ملت کے مسائل اور ان کے حل کے لئے کی جانے والی کوششوں کا جائزہ بتاتا ہے کہ اس ملت نے بھی پاؤں پاؤں چلنے والے بچہ کی مانند چلنے کی کوشش کی، آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ راہ میں لڑکھرائی بھی، گری بھی،۔۔۔۔۔ مگر بس جو فرق اس بچہ اور اس ملت میں باقی رہ گیا، وہ یہ ہے کہ اس معصوم بچہ کی مانند یہ مظلوم ملت اپنے رب کے حضور روئی نہیں، گڑگڑائی نہیں۔۔۔ اگر ملت نے رویا اور گڑگڑایا ہوتا تو مسجدوں نے اس کی گواہی دی ہوتی لیکن افسوس کہ آج بھی وہ نمازیوں کے نہ ہونے پر مرثیہ خواں ہیں!!

کوشش کرنا گویا بیچ ڈالنا ہے اور اپنی بے بسی کے اظہار کے ساتھ خدا کے حضور آنسو بہانا اس بیچ کو سینچنے کے مترادف ہے۔۔۔۔۔ جن شخصیتوں اور جن تحریکوں نے اس حکمت کو اپنایا گویا انہوں نے کامیابی کا راز پالیا۔۔۔۔۔ ان کی جانب سے کوششیں ہوئیں اور بساط سے زیادہ ہوئیں لیکن انہوں نے اپنی ان کوششوں کو چھلکے کی حیثیت دی اور دعاؤں کو مغز جانا اور مانا۔۔۔۔۔ دنیا نے دیکھا کہ ایسی تحریکیں اپنے مقاصد کے لحاظ سے اور نتائج کے اعتبار سے کامیاب اور بار آور رہیں۔۔۔۔۔ مسئلہ انفرادی نوعیت کا ہو یا اجتماعی نوعیت کا اس کے حل کا راستہ یہی ہے کہ میدان عمل میں جستجو اور کوشش میں کوتاہی نہ کی جائے لیکن اسی کے ساتھ اپنے پاک پروردگار کے حضور اپنی خستگی و بے بسی کا اقرار و اعتراف بھی ضرور کیا جائے۔۔۔۔۔ کون ہے جس کے بس میں یہ ”بے بسی“ نہ ہو۔۔۔۔۔ جس دن ”جستجو“ کے ساتھ ”خستگی“ کی اس روش کو ملت اپنالے گی انشاء اللہ اس دن منزل اسے سامنے کھڑی مسکراتی دکھائی دے گی!!

پنے بس میں ہے

رگ جاں سے قریب  
تھی منزل دور ہے

یہ شعر کہا ہو لیکن اس شعر کی روشنی میں ایک شخص بے اصغر نے گتھی سلجھا دی ہو اور ابھی ہوئی ڈور ن میں وہ سرا ”خستگی“ ہے۔۔۔ اور ”خستگی“ کیا کے لئے اپنے بس میں جو کچھ ہے، اسے ضرور کے حضور پوری اخلاص مندی کے ساتھ خود کو ہتر نتائج کے لئے اپنے رب سے امید رکھے

ایک ننھے اور معصوم بچے کی ماں ذرا دور بیٹھی  
چلنے کی کوشش کرنے کے مرحلے میں ہو۔  
ہتا ہو لیکن پھر لڑکھڑا کر گر پڑتا ہو، پھر اٹھتا ہو  
جاتا ہو۔۔۔۔۔ آخر کار وہ عاجز ہو کر رونے لگتا  
ار ہو جاتی ہو، اسے اس پر پیارا آ جاتا ہو اور وہ

میں تنہائی میں بھی اسے محسوس کر سکتا ہے، عجب نہیں کہ ندامت سے اس کی آنکھیں چھلک بھی پڑیں لیکن اس کے برخلاف اعتراف ہے جو علی الاعلان کیا جاتا ہے۔ اس اعتراف کیلئے حوصلہ چاہئے، تاب چاہئے۔ جب کسی انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے تو پھر ایسے انسان کی سوچ نہیں ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے بلکہ فکر یہ ہوتی ہے کہ میں اپنے ضمیر کے سامنے کیا جواب دوں گا۔ ضمیر کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا ہوتا ہے جگ کے داتا اور مالک کے سامنے جوابدہی کے تصور سے۔۔۔ جوابدہی کا یہی وہ تصور تھا کہ جب ایک ماں اپنے شیر خوار بچہ کو گود میں لئے دربار نبوت میں حاضر ہوئی تھی اور اس نے اپنے اوپر حد جاری کرنے کی بات کہی تھی، آج بھی انسانی ضمیر مر نہیں ہے اس کی تصدیق دنیا میں رونما ہونے والے واقعات سے ہوتی رہتی ہے۔ افغانستان و عراق پر حملہ سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی امریکہ کی ظالمانہ روش اور رویہ کی جس طرح مذمت ہوئی اور ہو رہی ہے وہ انسانی ضمیر کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔ انسانی ضمیر کی عدالت کا اسی نوعیت کا ایک اور فیصلہ ابھی چند دن پہلے دنیا نے ایک بار پھر سنا۔ عربوں کی زبان سے نہیں، بلکہ اسرائیلی فوجیوں کی زبان سے کہ وہ بے گناہ فلسطینیوں پر ظلم نہیں کریں گے اور اس ظلم کا گناہ اپنے سر نہیں لیں گے! آفرین ان باضمیر فوجیوں کو کہ جو شاعر کی زبان میں ”خود ہی قاتل، خود ہی شاہد“ تھے مگر ایسے نرالے منصف نکلے کہ انہوں نے اپنے ضمیر کی عدالت کے فیصلہ پر لبیک کہا اور اس کی پرواہ نہ کی کہ قوم کیا کہے گی اور قانون ان کو کہاں لے جائے گا۔

اس نوعیت کی مثالیں ہمارے اپنے ملک میں بھی سامنے آتی رہی ہیں۔ بابرہی مسجد کی شہادت پر اس وقت کے صدر جمہوریہ آنجنمانی ڈاکٹر شکر دیال شرما کا رندھی آواز اور پرہم آنکھوں کے ساتھ اظہار تاسف اکثر کو یاد ہوگا لیکن چند برسوں کے بعد چند ایک ایسے لوگوں کے نادم بلکہ تائب ہونے کی خبریں آئیں جنہوں نے مسجد کو شہید کر دینے کو عین کار ثواب سمجھا تھا۔ اسی نوعیت کی ایک مثال دنیا بھر میں گجرات کے فسادات کی بھرپور مذمت کی بھی ہے۔ انسانی ضمیر مردہ نہیں ہوا ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سو گیا ہو۔ ضرورت ہے کہ

## عدالت

کسی گاؤں اور دیہات یا قبیلہ کے معاملات ہوتی ہے۔ اور بچوں کے فیصلہ کو ماننے کیلئے کے علاوہ عام مہذب شہریوں کے فوجداری نظام کورٹ اور عدالتوں کا ہے۔ ان سب کی ان کی خدمات کا سب کو اعتراف!!

عدالت اور ہے اور وہ ہے انسان کے اپنے ضمیر کی اور نکھری ہوئی عدالت یہی ہے، نہ یہاں نر ہو تا ہے۔ اس عدالت میں نہ چرب زبانی پید، جیلوں بہانوں سے نہ تو جائز کو ناجائز ٹھہرایا بڑی عجیب عدالت ہے۔ یہاں مدعا علیہ ہی میں پیش کرتا ہے ”خود ہی قاتل، خود ہی شاہد“ دائر کیا ہوا!!!

سب پیدا ہوتی ہے جب مدعا علیہ خود ہی مدعی کرے اور اپنے ہی خلاف گواہی بھی دے، باہو بلکہ ضمیر زندہ بھی ہو اور روشن بھی۔

جب کہ دوسری چیز اس سے آگے کی چیز ہے لمبی کے احساس کی بات ہے تو انسان بند کرہ

## بے پر کی

ذہن میں کوئی بات آجائے اور اس سے اپنا مفاد وابستہ ہو یا اپنی انا کو تسکین ملتی ہو اور بعض دفعہ تو اس سے آگے بڑھ کر اس غلط افواہ کے عام ہونے میں چاہے اپنا مفاد بھی وابستہ ہو، مخاصمت یا جذبہ حسد کو تقویت ملتی ہو تو پھر دیکھئے کہ افواہیں پھیلانے اور بے پر کی اڑانے والوں کو کیسا لطف آتا ہے، افواہ کی جڑیں تلاش کی جائیں تو ان میں ایک مضبوط جڑ ”حسد“ کی ہوگی، حسد کی آگ بھی عجیب آگ ہے، جس کو آدمی خود لگاتا ہے، اور اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلتا رہتا ہے، البتہ اس آگ کے لپٹیں کبھی کبھار اس شخص کو جھلسا دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جس سے حسد کیا جا رہا ہوتا ہے مثلاً اس کے متعلق بے بات کی بات کہہ دی گئی، بے پر کی افواہ اس کے خلاف اڑا دی گئی تو آخر درجہ ہی میں سہی، اتنا اثر تو ہوگا ہی کہ وہ بے چارہ ذہنی اذیت اور کوفت کا شکار ہو جائے، اپنے ملنے جلنے والوں سے وہ آخر کس حد تک صفائی دیتا پھرے بس ایسے موقعوں پر تو چپ ہی بھلی اور معاملہ اس اللہ کے سپرد جو علیم بھی اور خبیر بھی، قہار بھی اور جبار بھی۔

بے پر کی اور افواہ تخریب کاری میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے، مشکل یہ ہے کہ افواہ کی بدولت کارستانیوں پہلے گل کھلا چکی ہوتی ہیں اور بعد میں اس کی تردید ہوتی ہے یا ہوتی رہے اس سے بھلا کس حد تک تلافی ہوگی، ہمارے ملک کے کتنے فسادات کا تجزیہ کیجئے، معلوم ہوگا کہ اس میں افواہ نے ہی اپنا رول نبھایا تھا۔

افواہ کا سرا جھوٹ سے جاملتا ہے، حسد اور تعصب کے جذبات اسے اور موثر بنا دیتے

میں دلاتی کہ اگر ظالم اپنی خوئیں چھوڑ رہا ہے  
مگا، البتہ ہم اپنی وضع کیوں بدلیں اور من حیث  
ظلم کو ظلم کہنے والے موجود تو ہیں!!! اور ضمیر کی

پنے اندر ایک عدالت ہے اور وہ ہے ضمیر کی  
س میں جانے سے پہلے وہ اپنے مقدمہ کو اپنے  
ما کہ وہ اپنی عدالت میں اپنے مقدمہ کو اگرچہ  
لر دیا ہے۔



## تعصب کا روگ

اللہ رب العالمین نے انسان کو جہاں اشرف المخلوقات کہا ہے وہیں اسے اسفل السافلین بھی قرار دیا ہے ایک صاحب ایمان مسلمان جب کرنے پر آتا ہے تو فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور جب گراوٹ و پستی پر آتا ہے تو درندوں کو بھی مات کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ کھلی رکھی ہے لیکن افسوس کہ بندوں نے اس پہ چلنا چھوڑ دیا ہے اور نیکی و بدی کے دو دھاروں میں بدی کے دھارے اور رخ کو اختیار کرنے کو ترجیح دی ہے۔

بدی ایک ایسا کڑوا کسیلا درخت ہے جو تیزی سے پھلتا پھولتا ہے اور غیر سلیم الطبع انسانوں کو اپنی طرف باسانی مائل بھی کر لیتا ہے، نیکی کے پھیلانے میں مشقت پیش آتی ہے جبکہ بدی کے پھیلنے میں محنت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، اس کا عام مشاہدہ دنیا کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

بدی کا ایک پرکشش لیکن دھوکے میں ڈالنے والا پھل ”تعصب“ بھی ہے اس کو ہم نے پرکشش اور پرفریب اس لئے کہا کہ نادان انسان بدی کے اس پھل کو کبھی نیکی سمجھ کر استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتا، اگرچہ تعصب ایک ایسا بیج ہے کہ خدا نخواستہ دل میں پڑ جائے تو پھر وہ اپنے پر پرزے نکالتا ہے اور اس کے ساتھ کئی ایک دوسری بیماریوں کو جنم دیتا ہے مثال کے طور پر ایک معاملہ اقرباء پروری کا ہے، اپنے رشتہ داروں سے محبت و چاہت ایک فطری امر ہے اور اسلامی حدود میں رہ کر اسے تحسین کی نظروں سے بجا طور پر دیکھا جاسکتا ہے مگر جب یہ محبت و مودت اپنے حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے تو اپنوں کے

بے کار فرما ہو، پھر دیکھئے کہ اس کے لئے کیسی کیسی میں کس کس فراخ دلی سے کام لیا جاتا ہے کہ سامنے داور لطف یہ کہ وہ خبر عام ہو چکی ہو۔

نیکوں اور اخلاقی قدروں کے گراف میں تقسیم ہیں، ایک تو عارضی اور وقتی ہوتی ہیں دیر پا ثابت ہوتی ہیں اس کی ایک مثال تاریخ لاں بادشاہ ستم گر تھا، ہندو کش تھا، دھرم دشمن کے تحت وضع کردہ افواہیں!!!

اور جھوٹ کو سچ بتانا ہوا کرتا ہے، عارضی اور وقتی سازش کے تحت افواہیں بھی اپنا کر شمع دکھاتی ہیں اور سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے مان لے لے بھی کہ افواہ پھیلانے والوں کے دلوں کو چھپا رہے ہوتے ہیں: ”یقولون ما یکتُمون“ (آل عمران: ۱۶۷)

ملیتی ہے اور انسان اتنی سطحیت پر اتر آتا ہے کہ  
س کرتا، یہی اقرباء پروری اور کنبہ پروری ہے  
ہے ارا مانوں کا خون کیا ہوگا اور کتنے اہل و لائق  
سے اقربا پروری کا ایک لازمی عنصر یہ ہوتا ہے  
رور عطا کیا جاتا ہے اور وہ اپنی نااہلی کی بناء پر  
نا ہے، کسی نااہل کو کوئی منصب عطا کیا جائے تو  
لئے ہاتھ پیر مارتا ہے، نتیجہ میں خوشامدی اور  
ہی لوگ اس کے ہاتھ پیر بن جاتے ہیں اور  
ہی وفادار نہیں ہو سکتے بلکہ وہ موقع پرست،  
لے پجاری ہوتے ہیں نتیجہ میں ادارہ نااہلوں  
م ہو جاتی ہے۔

میں انسان کو مبتلا کر دیتی ہے اور اسے جو نیکی  
فھے برے میں تمیز کرنا اور اسے اختیار کرنا۔ ہم  
یلیبہ کی شکل میں اتحاد کی وہ اساس فراہم کی گئی  
جاسکتا ہے، وہی امت اس بات پر متفق ہے  
جماعتوں کے مسئلے کو لیجئے بقول مولانا شاہ  
رے کا رقیب نہیں بلکہ رفیق ہونا چاہئے لیکن  
س سے بالکل مختلف ہے اور نوبت یہاں تک  
جہ ثانوی حیثیت کا ہو گیا ہے اور تحریکوں اور  
سوں ہوتا ہے کہ دوسری صحیح العقیدہ جماعتوں یا  
امت کے دن یہ نام نہاد تحریکی سرگرمیاں منہ  
نخریک کو تقویت پہونچانا تھا وہ پہونچ چکیں،

اسلام سے تمہاری کوششوں کو کوئی سروکار نہ تھا۔ تحریکوں کے ساتھ ساتھ یہی حال مسلک  
و مشرب کا ہے اور بعض دفعہ اس میں اتنی شدت آ جاتی ہے کہ جگ ہنسائی ہوتی ہے جیسے کہ  
عمرانہ کیس میں دیکھنے میں آیا اور بعض دفعہ مسلک و مشرب کی شدت نعوذ باللہ بت کی حیثیت  
اختیار کر لیتی ہے کہ سب کچھ ہو مگر ہمارے لات وعزی کے بارے میں زبان نہ کھولو۔

تعصب کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ اسے نیکی سمجھے جانے کے فریب نے اسے ایک  
تناور درخت بنا دیا ہے جسکے پھل باہمی نفرت و عداوت، بغض و حسد، کینہ اور شدت پسندی کی  
شکل میں ہمارے سامنے ہیں جس نے اتحاد بین المسلمین کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ اس سلسلے  
میں ہمیں مثبت انداز سے سوچنا چاہئے کہ اتحاد زندگی ہے اور انتشار موت، نیز اللہ کے رسولؐ  
نے اس امت میں ”امت پنا“ پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اور فرمایا کہ سارے  
مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ نیز امت کی مثال ”بنیان مرصوص“ کی ہے۔ آپؐ کی  
تعلیمات ایک دوسرے کے دلوں کو جوڑنے کی ہے آپؐ مشیخوں کے میساجتھے جوٹوٹے ہوئے  
دلوں کو باہم جوڑ دیتے تھے پھر اس موقع پر ہم اس فرمان الہی کو کیسے فراموش کر دیں کہ  
(واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا) نیز یہ انتخاب کہ اگر تم منتشر ہو گئے تو تمہاری ہوا  
اکھڑ جائے گی نتیجہ صاف ہے کہ دشمن با سانی غالب آجائے گا اور آج ہم یہ اپنی نظروں سے  
دیکھ رہے ہیں کہ ایک سپر پاور با سانی ترمودسرسی، سامراجیت اور اسلام دشمنی کی تمام  
حرکتوں کا ارتکاب کر رہا ہے اور پورا عالم اسلام خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب فسادات ہوتے ہیں تو بندوق  
کی گولیاں یہ نہیں پوچھتیں کہ تمہارا تعلق کس جماعت یا کس تحریک سے ہے وہ تو بس اتنا جانتی  
ہے کہ تم مسلمان ہو، علاوہ ازیں اسلام کے خلاف کھل کر بھی اور چھپ کر بھی جو منظم اور  
منصوبہ بند سازشیں ہو رہی ہیں افسوس کہ مسلمان ان سے کما حقہ واقفیت بھی نہیں رکھتا، زیادہ  
دور جانے کی ضرورت نہیں اسی ملک میں فرقہ پرست پارٹیوں کی جنم داتا ایک تنظیم ایسی  
منصوبہ بند کوششیں کر رہی ہیں کہ ان کا تعلق صرف فسادات سے نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے

پہنچانے کا ہے، اگر خدا نخواستہ عالمی اور ملکی سطح  
کیا مشرب کون سی تحریک اور جماعت اور

ہمارا مزاج

## قوم پرستانہ نہیں، داعیانہ ہو!

راقم الحروف ملی مسائل پر کچھ نہ کچھ سوچتے رہنے کا گنہ گار ہے، میں سوچا کرتا  
ہوں کہ ملت اسلامیہ ہند کا سب بڑا مسئلہ کیا ہے؟ کبھی اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ملت کا سب  
سے بڑا مسئلہ اس کی شناخت کا مسئلہ ہے، مسلم پرسنل لاء بورڈ، دینی تعلیمی کونسل اور دیگر موقر  
تنظیموں کی تشکیل کے پس پشت عوامل پر کوئی شخص سرسری نگاہ ہی ڈالے تو وہ بجا طور پر اس  
نتیجہ پر پہنچے گا کہ ہندوستان میں ملت کا ایک بڑا مسئلہ اس کی شناخت کا مسئلہ ہے، چنانچہ راقم  
السطور کا حال یہ ہے کہ صبح کا اخبار آنے پر وہ اس میں یہ تلاش کرتا ہے کہ ملت کو کہاں کہاں  
زک پہنچی، کہاں اس کی شناخت سے کھلواڑ کی کوشش ہوئی، اس کے وقار اور اس کی عزت کو  
ٹھیس پہنچانے کیلئے حریفوں نے اپنے ترکش سے کونسا تیر آزمایا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا میری  
یہ سوچ اور فکر مندی صحیح ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ سوچ اور فکر مندی غلط تو نہیں، البتہ بات اس  
سے کچھ آگے کی بھی ہے، ملت کی شناخت کی حد تک کی سوچ اور فکر، بہر حال ایک محدود سوچ  
اور فکر ہے، اور اپنی سوچ اور فکر کو صرف ملت کی شناخت کی حد تک محدود کر لینا محسن انسانیت  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کے لئے زیبا نہیں، ملت کے تئیں فکر مندی  
اور دردمندی بلاشبہ توفیق خداوندی ہے، اور اس پر اللہ رب العزت کا جتنا بھی شکر ادا کیا  
جائے کم ہے، مگر یہ محض ایک مصرعہ ہوا، اس میں ”انسانیت کے لئے دردمندی اور فکر مندی  
“ کے دوسرے مصرعہ کو شامل کرنا بھی ضروری ہے جس کے بغیر شعر پورا نہیں ہو سکتا۔

اور انسانیت کے لئے دردمندی و فکر مندی کا لازمی تقاضہ ہے، کہ داعی اعظم صلی

لاقائیت کا فریب بھی ہے، علاقائیت تعارف  
تعارض ہرگز ہرگز جائز نہیں لیکن افسوس کہ  
قے والوں کا ذہن نحن ابناء اللہ کا بن گیا  
ورت میں ہمارے وہ لوگ جو تامل اور ملیا لم  
والوں پر انگلی اٹھاتے ہیں یا برہمن، کھتری،  
ہیں انہیں اس پر اعتراض کا کیا حق پہنچتا ہے۔  
خصبیت کی تقسیم در تقسیم کا دروازہ کھول دیا گیا  
ان دروازوں کو ہمیشہ ہمیش کے لئے قفل لگا  
س کو مسدود نہ ہونے دیں۔

بہ تو کلت والیہ انیب

## علحدگی پسندی کا رجحان

پنپتا کیوں ہے؟

قوم ہو یا ملت، معاشرہ ہو یا خاندان، جماعت ہو یا جمعیت، ادارہ ہو یا حلقہ ارادت ان کی حیثیت اور قدر و قیمت اسی وقت برقرار اور قائم رہے گی جب ان سے وابستہ افراد لڑی میں پروئے ہوئے دانوں کی طرح تسبیح کی شکل اختیار کر کے ایک اور متحد ہونے کا ثبوت دیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر تسبیح ٹوٹی کب ہے اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے دانے بکھر جاتے اور اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں ان میں ایک وجہ فرقہ بندی بھی ہے فرقہ بندی کے پس پشت رائے کے اختلاف کو کم اور مفاد پرستی کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور اس صورت میں اختلاف مخالفت کا روپ دھار لیتا ہے۔ لیکن تسبیح کے دانوں کے بکھر جانے کا یہ صرف ایک پہلو ہے جبکہ اس کے دوسرے پہلو کا تعلق انتظام و انصرام اور قیادت سے ہے اگر انتظام و انصرام میں کچھ ایسے عوامل کو اثر انداز ہونے کی اجازت دے دی جائے جن سے کام کرنے والوں کا دل ٹوٹے اور ان کے حوصلوں کو شکست و ریخت کا احساس ہو ان عوامل کے نتائج میں سے ایک نتیجہ حق تلفی کا ہے جہاں حق تلفی کا احساس جاگتا ہے مظلوم شخص یا جماعت کی توانائیاں اور صلاحیتیں یا تو پڑمردگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور وہ شخص سمجھ جاتا ہے یا پھر اس میں علحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہوتا ہے اور وہ کارواں سے علحدہ دوسری راہ کو تلاش کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے اور خدا نخواستہ اگر شدت احساس نے اس میں رد عمل کی کیفیت پیدا کر دی تو وہ تنگ آمد بچنگ آمد پر بھی اتر سکتا

و، داعیانہ مزاج کے بغیر محض ملت کے تئیں ناک بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی بن جائے، اور خدا نخواستہ اس طرح نادانستہ لئے ایک بت تراش لیں، العیاذ باللہ اس قسم (اور یقیناً رنج ہونا چاہئے۔) لیکن اگر اس سبب بندگان خدا شرک جیسے عظیم گناہ میں ملوث کے اس فریب سے بچتے رہنے کا راستہ یہ ہے کے اپنے منصب و مقام کو بھی نہ بھولیں اور ہم دنیا کی آگ میں جھونکنا چاہتے ہیں، ان کو زبہ و حوصلہ بھی مسلمان اپنے اندر پیدا کر لیں توجہ ہو، اور پتھر دل بھی موم ہو جائیں اس لحاظ کا مسئلہ ہے، یہ ملت اپنے آپ کو پہچانے کہ کس لئے پنا کی گئی ہے؟ وہ امت دعوت ہے ملی شناخت گم کر دینے کی کوششیں اس لئے بھی خست یعنی دعوت سے ہی منہ موڑ لیا ہے۔ جبکہ کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلائے اور

عَبَادُ اللَّهِ (البقرة - ۲۲۱)

صرف اپنے حکم سے“

ف پکار رہا ہے“

## ”دوہرا معیار“ فساد کی جڑ ہے

خدا بخشے مولانا ابوالعرفان خاں ندوی مرحوم کلیۃ الشریعہ ندوہ کے ڈین (Dean) کو! بڑے زندہ دل اور بذلہ سخا چٹکیوں میں گتھیاں سلجھانے کا بھی اور سمجھانے کا بھی سلیقہ، بلکہ ملکہ قدرت نے ان کو بخشا تھا، ایک دفعہ کسی صاحب نے ان سے سوال کیا کہ مولانا! ٹیری کاٹ پہننا کیسا ہے، فرمایا کہ اُس وقت تک بالکل حرام ہے جب تک وہ مجھے مہیا نہ ہو جائے۔ مسئلہ ٹیری کاٹ کا نہیں تھا، اس نفسیات کی کاٹ کا تھا جو دوہرے معیار کو برتنی ہے اور عملاً اسے اپناتی ہے۔ مثلاً مسئلہ یا چیز ایک ہی ہو لیکن اسے صحیح یا غلط قرار دینے کا پیمانہ اور کسوٹی یہ ہو کہ اس سے اس کا مفاد وابستہ ہے یا نہیں، مفاد پائے جانے کی صورت میں وہی بات صحیح ہو جائے اور نہ پائے جانے کی صورت میں غلط۔

دوہرے معیار کی بنیاد خود غرضی پر ہے، تعصب اور عصبیت پر ہے، چنانچہ جب ایسی بنیادوں پر فیصلے کئے جاتے ہیں یا کوئی رائے قائم کی جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ انصاف پر مبنی نہیں ہو سکتی اور نتیجتاً ایک فریق ظلم و زیادتی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جو فریق ظلم کا شکار ہوگا اس میں رد عمل کا پیدا ہونا ایک فطری بات ہے، مظلوم کے لئے اس لحاظ سے یہ بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ رد عمل میں حدود سے تجاوز نہ کرے اور اس بات کو نہ بھولے کہ انتقامی کارروائی میں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مظلومیت کی سرحدوں کو پار کر کے خود ظالم و ستم گر بن بیٹھے۔

ایسے موقع پر اسلام عفو و درگزر سے کام لینے کی ہمت افزائی کرتا ہے، وہ امن و سلامتی کا پیامبر اور صلح و آشتی کا علمبردار ہے، لیکن بد قسمتی سے میڈیا ان دنوں اپنا سارا زور اس پر صرف کر رہا ہے کہ کس طرح اسلام اور مسلمانوں کو امن عالم کے خطرہ قرار دے دیا جائے۔ ع

کی وجوہات ”باہر نہیں“ اندر“ تلاش کی جانی  
م لینا چاہئے کہ کہیں اس سے ظلم یا حق تلفی تو  
کے مختلف گوشوں سے متعلق سچر کمیٹی کا جائزہ ان  
کمیٹی کی رپورٹ مسلمانوں کی پس ماندگی کی  
س طرح مسلمانوں پر بے بنیاد الزامات عائد  
رے میں کھڑا کیا جا رہا ہے یہ دونوں صورت  
حقوق سے محروم رکھا گیا جو ان کے دستوری  
رامات و اتہامات عائد کر کے ان میں خوف  
بہر حال ایک بیمار ذہنیت کی علامت ہے جو  
الگ تھلگ کر دیئے جانے کی سوچ و فکر کو جنم  
اس ”بیمار ذہنیت“ کی تشخیص کر کے اس کی  
اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہاں بسنے والی  
س اور توانائیاں ملک کی تعمیر میں کام آئیں اور  
سکے۔

س وجہ حق تلفی، ظلم اور بے جا الزام تراشی ہے نہ  
روضے!!۔

حسن کرشمہ ساز کرے

امن عالم کو جب جب بھی جن طاقتوں سے  
تاریخ کے صفحات اس سوال کا جواب نفی میں  
نہرہ ہے، جبکہ چنگیز خاں مسلمان نہیں تھا، پہلی  
ب کو معلوم ہیں جب کہ ان دونوں جنگِ عظیم  
فاشزم اور نازی ازم کی تیل ان گنت انسانی  
ن میں بھی مسلمانوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا  
نہ ہی موسولینی، اسی طرح اسٹالن کی مثال لیجئے  
اتار دیا۔

یا جاتا ہے، وجہ ظاہر ہے کہ دنیا دو ہرے معیار  
کے لئے بڑی طاقتیں اگر واقعی سنجیدہ ہیں تو  
جو بات کی طرف توجہ دینی ہوگی جن کی حیثیت  
س برائی ”دوہرا معیار“ بھی ہے۔

دن دینا ہے جبکہ اسے ترک کر دینا انصاف کے  
پالیسی کو اپنا کر امن عالم کی توقع رکھنا ایسا ہی  
بھلنے کی تمنا کرنا۔

## متمدن دنیا کے یہ قیدی!!

نیو ورلڈ آرڈر کے نقیب امریکہ کے ہاتھوں بغداد کے نواح میں واقع ابو غریب  
جیل میں عراقی قیدیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز اور انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا گیا، اس کی  
گونج ساری دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔ ع  
پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ خبروں کے مطابق عراقی قیدیوں کو عریاں  
کیا گیا، وحشیانہ عمل کرنے پر انہیں مجبور کیا گیا اور دیگر شرمناک حرکتوں کی تصویروں کی  
اشاعت کی گئی۔ ان حرکتوں کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالی جا رہی ہے اور صدر امریکہ  
نے اپنے وزیر دفاع کو امریکی فوجیوں کے خلاف سخت کارروائی کا حکم بھی دے دیا  
ہے۔۔۔۔۔ یہ ہے ایک تصویر خود کو مہذب و متمدن کہنے والوں کی، حقوق انسانی کے تحفظ کا  
دم بھرنے والوں کی اور جنگی قیدیوں کے سلسلہ میں بین الاقوامی قرار دادوں  
اور Resolutions پاس کرنے والوں کی!!!

لیکن ایک تصویر ایسی بھی ہے جس کا مقدر ہے کہ وہ کبھی ماند نہ پڑے بلکہ وقت  
گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خدو خال اور واضح اور نمایاں اور روشن و تاباں ہوتے چلے  
جائیں۔ وہ تصویر ہے معاشرہ نبوی ﷺ کی جو رہتی دنیا تک کے لئے آئیڈیل اور نمونہ ہے  
اور نمونہ رہے گی۔

بدر کے قیدیوں کے ساتھ رحمت عالم ﷺ نے جو حسن سلوک کیا تھا اس پر تاریخ  
کے اوراق شاہد ہیں قیدیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے کی نصیحت فرماتے ہوئے ارشاد ہوا تھا



لئے مقرر فرمائی تھیں اور کہیں وہی خامیاں تو ہمارے معاشرے میں در نہیں آئیں جن سے احتراز و اجتناب ہمیں دوسری قوموں سے ممتاز و ممتاز کرتا ہے۔ آہ! کیوں نہ کہا جائے کہ صورت حال کچھ ایسی ہی ہے گستاخی معاف..... نیکی برباد اور گناہ لازم کے مصداق! کیا ہم نے اس عظیم موقعہ کو محض ایک میلہ بنا کر نہیں کھو دیا اور تربیت فکر اور تربیت عمل کی غذا حاصل کرنے کے بجائے ان مجلسوں کو محض جوش و خروش، شان و شوکت، دبدبے وطننے کا ذریعہ نہیں بنا لیا؟ پوری سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ بتائیے کہ ان باتوں کو دور دور کی بھی کچھ مناسبت اسلام سے ہے؟ آخر عید میلاد کی یہ عظمت و طہارت کیونکر داغ داغ ہوئی..... اسی لئے تو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا ہمارا اظہار رسمی رہا اور محبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی تقاضے یعنی اسوۂ حسنہ کی پیروی کی فکر ہمیں کبھی دامن گیر نہ ہوئی..... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتساب پر فخر کرنا تو ہمیں یاد رہا لیکن اس سعادت کے عوض عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ہم نے پس پشت ڈال دیا، اس شب ہم نے گلیوں اور سڑکوں کو تو بقعہ نور بنا دیا لیکن اپنے دلوں کی کوٹھریوں میں اندھیرا ہی رہا۔

من کی دنیا سے ظلمتوں کی شب تار سحر کرنے کی تدبیر اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کیا ہو سکتی ہے، ایک طرف تو ہماری خوش بختی کہ حیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ پوری طرح محفوظ ہے جس میں ہر شعبہ کے لئے رہنمائی موجود ہے اور دوسری طرف ہماری بد بختی کہ ہماری زندگی کے بیشتر گوشے پیروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عاری اور محروم ہیں۔

عید میلاد کا دن تقریبات منا کر مطمئن ہو جانے کا دن نہیں بلکہ اپنے عمل و کردار کا جائزہ لے کر بے قرار و مضطرب ہو جانے کا دن ہے، اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھنے کا دن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صراط مستقیم کی طرف ہمیں پکارا تھا اس پر ہم کس حد تک گامزن رہے۔ کیا ہم نے قرآن کی اس کسوٹی پر پورا اترنے کی کوشش کی کہ ”جو کچھ تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملے اسے قبول کرو اور جس چیز سے تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روکیں اس سے رک جاؤ“ بد قسمتی سے جو برائیاں ہم میں گھر کر رہ

## س کے تقاضے

شہر لکھنؤ برقی قہقروں سے جگمگا اٹھا ہے۔ رات ن ہے۔ ایک سیل رواں ہے، بوڑھے بھی اور مہمی..... جا بجا عید میلاد النبی کی محفلیں بھی ہیں پر ہے اور شعراء کی تخیل آفرینی بھی اپنے کمال سے اظہار عقیدت و محبت کا دن ہے..... اس اور بے اعتدالیاں بھی سامنے آئیں لیکن یہ ہے جو ہے بے انتہا خوبصورت، بڑا دلکش اور ان بھی تو ہے! پندرہ سو برس کی ملت کی تاریخ و تند ہوا میں نہ چلیں لیکن اس ملت کے رشتہ کو بنیادی وجہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بیات بھی اسی کا ایک اظہار ہے اس لئے کس اور غلط کہے!

لیجئے اور اظہار کے ان مروجہ طریقوں پر بھی بے پردگی اور روح اسلامی سے عاری اور خود ہی فیصلہ بھی کر دیجئے کہ کہیں ہم نے اس تو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے



نے اپنے اندر پیدا کیا اور کیا کبھی ان احادیث کو میں کچھ گنا ہوں کی نشاندہی کے بعد آپ صلی و علیہ وسلم کی گئی ہے؟

یہ جذبہ ہم میں آخر کیسے پیدا ہوا؟ اکبر نے کہا

آثار و نشان سب قائم ہیں

اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

مٹ پیدا کرنے کی ایک تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ احادیث رسول بھی ہمارے مطالعہ میں ہو۔ علماء کے پیش نظر احادیث کے انتخاب و تشریح کا ہے، اگر ایسی کتابوں کے صفحے دو صفحے ہی روزانہ زندگی پر اس کے خوشگوار اثرات نہ مرتب ہوں انسانی کردار کی تربیت کا آغاز ہو سکے گا۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو حاجت کیا؟ مومن کی شان بلکہ پہچان یہ ہے کہ وہ جو لئے بھی چاہتا ہے۔ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے رسول ہمارے دلوں میں رچ بس جائے تو کیا نسبت رسول کی اس نعمت سے عام انسانی معاشرہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت جبکہ عقیدت و محبت رسول وہ کڑی ہے جو محض وہ کو ایک لڑی میں پروردینے کی قوت و صلاحیت ہیں کہ اگر چہ دنیا کی زبان پر لا الہ الا اللہ کے

بول نہیں ہیں لیکن عمل کی سطح پر اسے اس حقیقت کا اعتراف ہے چنانچہ ایک موقع پر چین کے رہنما ماؤ زے تنگ نے بھی کہا تھا کہ میں اپنے خدا سے ملنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ اب اسے ہماری کوتاہی کے سوا کیا کہا جائے کہ ہم دنیا کو کلمہ کے دوسرے جز یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت باور نہیں کرا سکے اور اس حقیقت کو اسے سمجھا نہیں سکے۔

کہاں ہیں وہ مبارک نفوس جو لا الہ الا اللہ کا عمل کی سطح پر اعتراف کرنے والی دنیا سے کلمہ کے دوسرے جز ”محمد رسول اللہ“ کا اقرار کرانے کے لئے خود کو وقف کر دینے کی ٹھان لیں اور رسول سے وفا کے عوض اللہ کی رضا مندی کے حقدار بن جائیں۔

کرنے والی تنظیموں ہی کی ذرا خبر لیجئے، آپ کو وہاں دوسری خوبیاں بھلے ہی مل جائیں لیکن بس ایک بے چارہ ”اتحاد“ ہی ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ یہ مثال بھی ملک گیر سطح کی ہوگئی۔ ذرا اپنے گرد و پیش ہی پر نگاہ ڈالئے اور اپنوں کے ہاتھوں چلنے والے دو چار اداروں ہی کو دیکھ لیجئے۔ اگر ان کی شہرت اور شناخت ہے تو اس کا بھی تجزیہ کیجئے کہ یہ حسن کارکردگی کی وجہ سے ہے یا نزاعات و اختلافات کی بدولت۔!!

اس سے بھلا کسے انکار کہ ملت کی کشتی گرداب میں ہے لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ اس کشتی کا کیا بنے گا جس کے اندر طوفان گھس آیا ہو اور وہ بھی غیروں کا نہیں، اپنوں ہی کا پکا کیا ہوا ہو۔ اب آپ سے کوئی پوچھے کہ اندر کے اس طوفان سے نپٹنے کی آخر کیا صورت ہے تو آپ کا جواب یہی نا ہوگا کہ دلوں کے غبار کو صاف کر کے اتحاد کا مظاہرہ کیا جائے!! یقیناً اس پر قابو پانے کی تدبیر اتحاد ہی ہے لیکن اتحاد بغیر ایثار کے تو ممکن نہیں، چرخ کہن نے روئے زمین پر سب سے پائیدار اتحاد انصار و مہاجرین کی مواخات کی صورت میں دیکھا اور تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ اس بے نظیر اتحاد کے استحکام کی ایک بنیاد ایثار کی تھی۔

اتحاد کا لفظ کانوں کو جس قدر بھلا لگتا ہے ایثار کا عمل نفس پر اس سے کہیں زیادہ گراں گزرتا ہے۔ لیکن جب ایک شخص خدا کا نام لے کر خدا ہی کے لئے ایثار کی اس کٹھن منزل سے گزر جاتا ہے تو پھر وہ شادمانی اور شاد کامی کی کیفیتوں کو اپنے لئے مسخر پاتا ہے اور اسے کسی چیز کے کھونے میں وہ لذت ملتی ہے جو اسے پانے میں حاصل نہیں ہوتی۔

ایثار، انتشار کے رفع کرنے کا ایک مؤثر ہتھیار ہے۔ جگر گوشہ رسول حضرت حسنؓ کا عمل اس کی ایک نہایت روشن اور پاکیزہ مثال ہے۔

ہماری اپنی کشتی کے اندر کے طوفان پر قابو پانے کی تدبیر حضرت حسنؓ کی سیرت میں موجود ہے۔ یہ وہ تدبیر ہے جو ہمارے اپنے بس میں ہے۔ یہ تدبیر بیرون سے امداد کی نہیں بلکہ انسان کے اندرون کے بناؤ کی طالب ہے اور اندرون کے اس بناؤ کا راز خود اپنے آپ

## کشتی کے اندر ہو

شہر حیدرآباد میں گزرے۔ ان تین ہفتوں میں ب اس لئے یاد رہ گئیں کہ ان کا سلسلہ زیادہ ساحلی علاقوں میں آئے ہوئے طوفان اور اس۔ اور دوسری خبر حیدرآباد کے ایک جامعہ کے نیز اس جامعہ کے جلسہ دستار بندی کی اور اس تار کی ان کی اپنے ہم مشربوں ہی کی جانب اول الذکر سمندری طوفان اور ثانی الذکر

ئے کہ ان میں کیا فرق ہے؟۔ اگر معاشرہ کو کشتی ن پائے جانے والے فرق کو سمجھنے میں دشواری د میں ہے جبکہ ثانی الذکر صورت حال بتا رہی

موقوف، ہندوستان ہی نہیں، دنیا کے مختلف ی جائزہ لے لیجئے تو ان میں سے اکثر گوشے بند رہے ہوں گے۔ پاکستان و افغانستان کے اس ملک میں اتحاد بین المسلمین کا نعرہ بلند

مر ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اپنے آپ پر قابو  
س کے مقابلہ میں کہیں زیادہ سخت اور مشکل  
ایثار کے جذبہ کے تحت خود پر قابو پانے کی یہ  
اتحاد کے راستہ کی کوئی مشکل باقی نہ رہے گی  
س اپنی کشتی کے اندر کے طوفان پر قابو پالیں  
س سے لڑنے کے لئے وہ حوصلہ بھی نصیب

## کہیں ہم پر جعل سازی کا مقدمہ نہ قائم ہو

سال گزشتہ ماہ صیام میں ملت اسلامیہ کی ایک نہایت برگزیدہ شخصیت کے یہاں  
حاضری ہوئی، نماز جمعہ کے بعد ان کا بیان سننے کی سعادت میسر آئی دوران تقریر ”من صام  
رمضان ایماناً واحتساباً غفر لہ ما تقدم من ذنبہ“ (جو شخص رمضان میں ایمان  
واحتساب کے ساتھ روزے رکھے گا تو اس کے پچھلے گناہ بخش دئے جائیں گے) کے ضمن  
میں فرمایا کہ ایمان و احتساب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال، ثواب کی امید رکھتے ہوئے اور اللہ  
کی مغفرت و خوشنودی کے وعدے پر یقین کرتے ہوئے انجام دئے جائیں۔ پھر فرمایا کہ  
رمضان روزوں کے لئے ایمان و احتساب کی قید اس لئے پیش آئی تاکہ روزے کی روح  
اور حقیقت کی حفاظت ہو جائے اور ایک مسلمان کی نگاہ روزہ کے مادی اغراض و مقاصد یا  
طبی یا ظاہری قواعد کے اصول پر نہ ہو بلکہ اس کا دل ایمان، نیت روزہ کی اہمیت اور اللہ کی نگاہ  
میں روزے کی قیمت کے یقین اور استحضار سے معمور ہو۔ ایمان و احتساب کی اس تشریح  
کے بعد یاد آتا ہے کچھ اس مفہوم کی بات ارشاد فرمائی کہ دین کے نام پر ہونے والے بہت  
سے کام ایمان و احتساب کی روح سے خالی دکھائی پڑتے ہیں۔ اجتماعی لحاظ سے ایک مرض  
کی نشاندہی کرنا تو ان ہی کا حق تھا اور ان ہی کو زیبا بھی۔ لیکن راقم آثم کو ذاتی طور پر یوں  
محسوس ہوا جیسے یہ بات اسی کے لئے کہی گئی ہو اور اسے آئینہ دکھایا گیا ہو۔ شام ہونے سے  
قبل میں وہاں سے نکل پڑا لیکن ایمان و احتساب سے اپنے خالی ہونے کا احساس دل  
و دماغ پر چھایا رہا۔

نصیب ہو جس کی بدولت پوری زندگی خالص عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن سکے۔  
خدا کرے، ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس سلسلہ میں ہماری آنکھ کھل جائے  
ورنہ الامان والحفیظ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آخرت کے بازار میں ہمارے کاموں کی قیمت لگنا تو  
درکنار، الناجل سازی اور فریب دہی کا مقدمہ ہم پر قائم ہو اور اس پونجی کی بربادی کا علم  
وہاں ہو جہاں انسان کوڑی کوڑی کا محتاج ہوگا۔!!

نہ تھا چنانچہ کتابوں کی الماری سے سیرت سید  
سرخی ایمان و احتساب پر نگاہ پڑی تو دل کی  
لی کا موجب تھے!!۔ چنانچہ اس باب کو پڑھتا  
ہوا کہ جیسے کسی نے نہ صرف مرض کی تشخیص  
کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہو۔ سید ابو محمد صاحب  
میں تشریف لائے اور کہا کہ ”میاں صاحب،  
سے نکلا ہوں آج تک میرا یہی خیال رہا کہ  
نہ رہوں، جب ان کو اللہ کہیں عروج دے گا،  
آج تک خدا کے واسطے رہا اور نہ کچھ ثواب  
سے توبہ کی اور اسر نو آپ کے ہاتھ پر اللہ کی  
وں آپ نے ان سے بیعت لی اور ان کے  
سے ایک عجیب حال طاری تھا۔ دعا کے بعد  
کے کی طرف چلے، ان کی آنکھوں سے آنسو  
پاؤں رکاب میں رکھا اور آواز بلند پکار کر کہا  
ٹھوڑے پر اپنی شان و شوکت اور خواہش نفس  
کچھ نہ تھا، مگر اس وقت ہم محض اللہ تعالیٰ کی  
وڑے پر سوار ہوئے ہیں۔“

ایک بار پھر پڑھ لیجئے۔ سید ابو محمد صاحب کی  
میل کرنے کی تاب نہ ہو تو خلوت ہی میں اپنا  
ت، نام و نمود اور خواہش نفس کے لئے ہیں یا  
طے، کیا عجب کہ رمضان کے اس مہینہ میں جبکہ  
ہو جائے۔ اور ایمان و احتساب کی وہ دولت

اور اس کی شناخت اسی سے قائم ہو جبکہ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ بلا واسطہ صیہونیت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہو۔

صیہونیت کے مکر و فریب سے کچھ بھی بعید نہیں کہ وہ ایسی شخصیتوں یا تحریکوں سے بھی اپنے مذموم ارادوں کو پورا کرنے کا کام لے رہی ہو جس سے وہ شخصیت یا تحریک لاعلم ہو اور لاشعوری طور پر نتائج کے لحاظ سے اس کے اقدامات کا فائدہ صیہونیت کو پہنچ رہا ہو۔

صیہونیت کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک احساس برتری بھی ہے۔ کسی میں اپنے برتر ہونے کے احساس کا مطلب ہیکہ وہ دوسروں کو کم تر اور حقیر سمجھتا ہو۔ احساس برتری کی ذہنیت ہر حال میں اپنی بالادستی چاہتی ہے اور اپنی بالادستی چاہنے کا مطلب ہے دوسروں کو زیر کرنا اور زیر رکھنا۔ دوسروں کو کمتر سمجھنا بہت سی برائیوں کے پھیلنے اور فروغ پانے کا ذریعہ بنتا ہے اور اسی طرح بالادستی کی ذہنیت کے کوکھ سے ظلم و جبر اور دہشت گردی جنم پاتے ہیں۔ چنانچہ آج جبکہ دنیا میں مختلف ملکوں میں ظلم و جبر ہوتا دکھائی دے رہا ہے، تو عجب نہیں کہ اس کے ڈانڈے صیہونیت سے جاملتے ہوں۔ اس طرح صیہونیت فساد فی الارض کا باعث بن رہی ہے۔

صیہونیت نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھے ہیں تاکہ اس کو پہچانا آسان نہ ہو سکے۔ اس کا ایک چہرہ مظلومیت کا بھی ہے۔ اپنی ہی عدالت میں خود کو مظلوم قرار دے کر دوسروں پر ظلم کرنے کا جواز پیدا کر لینے میں بھی اسے کمال حاصل ہے۔ اپنے دشمن کو زیر کرنے کی اس کی چالیں اور تدبیریں بھی بڑی ہوشیاری و عیاری پر مبنی ہوتی ہیں، اس کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمن کو کھوکھلا کر دے، دشمن کو کھوکھلا کرنے کا یہ کام صیہونیت ہر سطح پر کرتی ہے اقتصادی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی ہر سطح پر وہ اپنے حریف کو کمزور و بے بس دیکھنا چاہتی ہے، دشمن کی بشری کمزوریوں پر نگاہ رکھنا اور اس سے حسب موقعہ فائدہ اٹھانا اس کی ایک اہم حکمت عملی ہے۔

حاصل یہ کہ صیہونیت کا بڑا حربہ دجل و فریب ہے۔ بالادستی و احساس برتری کی ذہنیت ہے، اس ذہنیت نے عیسائیوں اور یورپ کو بھی نشانہ بنایا اور اب وہ مسلمانوں کو اپنا

## ہے حکمت و فراست

میں محبت کے سوا  
’گرفتار ہونے والوں سے شکوہ کیا تھا لیکن  
’کھائے جا رہا ہے کہ آخر دنیا میں نفرت کا زہر  
’صیہونیت ہے۔ جس کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی اور  
’کے لائحہ عمل کا مرکزی نکتہ تخریب کاری ہوگا  
’ان دشمنی اس کے سرشت میں ہے اور مسلمان  
’ہے کہ اسلام کو ایک نظام حیات کی حیثیت  
’ماں جہاں ایسی کوششیں ہوئیں اور مسلمانوں  
’یسی جدوجہد کو نام بنانے کے لئے صیہونیت

’اور چالبازی ہے۔ نہ معلوم کتنی کٹھ پتلیاں ہیں  
’وران میں سے ہر ایک کا بظاہر مستقل وجود معلوم  
’کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اپنی ہر جنبش کے لئے  
’صیہونیت کا علمبردار یا آلہ کار ہوتا ہے۔

’یت تو یہ ہے کہ وہ براہ راست اس کا نمائندہ ہو

ٹیوں کا ایک طبقہ اس کا حلیف بنا ہوا ہے۔  
 مان کیا کریں؟ جواب بالکل صاف اور واضح  
 سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ حکمت کو مومن کا گمشدہ  
 مایا گیا کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ مومن

## ہم اپنا بیج منفی نہ بنے دیں!

کبھی آپ کسی بڑے شہر کے کسی ایسے بک سیلر (Book Seller) کا رخ کریں  
 جہاں مختلف زبانوں خصوصاً انگریزی میں شائع ہونے والی کتابیں فروخت ہوتی ہوں تو ان  
 دیدہ زیب کتابوں میں آپ کو بہت سی ایسی تازہ اور نئی کتابیں دکھائی دیں گی جن کا موضوع  
 ہوگا جہا، دہشت گردی، عورت اور اسلام اور مدارس وغیرہ وغیرہ..... ان دنوں ایسے  
 موضوعات پر اغیار کی جانب سے کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور ہاٹ کیک (Hot Cake) کی  
 طرح فروخت بھی ہو رہی ہیں۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ۱۱ ستمبر کے حملہ کے بعد اسلام کا رشتہ دہشت گردی سے جوڑنے کی مہم  
 میں جو تیزی آئی ہے، مذکورہ کتابوں کی تالیف اور نشر و اشاعت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی  
 ہے تاکہ یہ ذہن بنانے میں مدد ملے کہ شدت پسندی اور انتہا پسندی مدارس کی دین  
 اور پیداوار ہے یہی وہ مراکز ہیں جہاں رجعت پرستی کی تعلیم دی جاتی اور دہشت پسندی کی  
 تربیت دی جاتی ہے۔

سیاسی مقاصد کی برآوری کے لئے مدارس کے خلاف اس طرح کی تشہیر باطل کے آزمودہ  
 نسخہ کے بموجب کی جا رہی ہے کہ جھوٹ کو اس قدر دہرایا جائے کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگے  
 ، خصوصاً ایسی صورت حال میں جبکہ مدارس کی حقیقت سے عوام یا تو سرے سے لاعلم ہے یا پھر  
 بہت کم واقفیت رکھتی ہے، لاعلمی یا کم علمی کے ایسے ماحول میں غلط فہمی کی بیل آسانی سے پھلتی  
 پھولتی ہے چنانچہ اس صورت حال کا فائدہ مدارس مخالف مہم کو بھی پہنچ رہا ہے۔

اس طرح بڑی چابکدستی سے مدارس کے موضوع کو ایک نازک اور حساس موضوع بنا

ت ضروری ہے اس لئے کہ یہ بات مومن کی  
 بلن صیہونیت سے خوف کھانے کی ضرورت  
 کے لئے گنجائش نہیں کہ وہ کسی اور سے بھی  
 رہے کہ ہم میں وہ حکمت و فراست ہے بھی یا  
 گیا ہے۔

## کاما، نہ کہ فل اسٹاپ

آس اور یاس کے الفاظ زبان پر جس قدر آسان ہیں، انسانی زندگی کے لئے اتنے ہی مؤثر۔ کہنے والے نے کہا اور خوب کہا کہ جب تک سانس تب تک آس۔ سچ بھی یہی ہے کہ امید پہ دنیا قائم ہے اور زندگی کی بہار و رونق اسی کے دم قدم سے ہے ورنہ یاس و ناامیدی تو خزاں کا دوسرا نام ہے۔ آس لگائے رکھنے والوں کو رجائیت پسند (Optimist) کہا جاتا ہے اور یاس کا شکار ہونے والوں کو قنوطیت پسند (Pessimist) رجائیت پسندی اور قنوطیت پسندی ایک رجحان ہے جو انسان کی زندگی کا رخ طے کرتا ہے۔ وہ اس کی فکر اور سوچ پر اثر انداز ہوتا ہے اور سوچ انسان کے طرز عمل پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی مثلاً آدھے گلاس پانی کو پا کر ایک رجائیت پسند انسان یہ کہے گا کہ آدھا گلاس بھرا ہوا ہے، جب کہ ایک قنوطیت پسند انسان اسے یوں کہے گا کہ آدھا گلاس خالی ہے۔ رجائیت پسندی ایک انسان میں مثبت طرز عمل کو پیدا کرتی ہے اور اس کے برخلاف قنوطیت پسندی منفی طرز عمل کو جنم دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ مثبت طرز عمل کے نتائج مثبت اور منفی طرز عمل کے نتائج منفی ہی ہوں گے۔ رجائیت پسندی انسان کو ایک ایسے حوصلہ سے سرشار کرتی ہے جو ناممکنات کو بھی ممکن بنا کر دکھا دے جب کہ قنوطیت پسندی موجود کامیابی کے امکانات کو بھی اس کے لئے بیکار و غیر مفید بنا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے ”آس“ اور ”یاس“ انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے نہایت اہم عوامل ہیں البتہ ان میں سے کسی ایک کو اپنانے کے معاملہ میں انسان آزاد ہے۔ گویا یہ ایسے دو سوچ (Switch) ہیں کہ ان میں سے وہ اگر آس کے سوچ کو

چنے لگیں کہ ان مدارس کا وجود مہذب و متمدن  
س کے برخلاف مسلمان بجا طور پر یہ محسوس  
ات کے ذریعہ ملت کے وجود اور اس کے دینی  
مرحلہ ہے جہاں مسلمانوں کی سوچ بوجھ کی  
ملی کی کہ مسلمان ایسے موقعوں پر جذبات اور غیر  
جلد اشتعال قبول کر لینے کے مزاج نے ملت کو  
سہل انگاری کی بدولت اغیار کے ناپاک  
ہوئے ہیں آزمائش کی یہ گھڑی ہم سے نہایت  
کام لینے کی متقاضی ہے، ملت کی حکمت عملی  
نا کام ہو جائے۔

سورت حال ہے اس سے نبرد آزما ہونے کے  
نے کے دو کام بنیادی نوعیت کے ہیں۔  
ملک و مشرب سے بلند ہو کر ارباب مدارس کی  
رکوتا ہیوں کے سد باب کی واقعی اور مخلصانہ  
لئے جو مشترکہ حکمت عملی طے کی جائے، اس

حقیقت سے متعلق واقفیت کی مہم۔۔۔ مدارس  
ہیں ان کے درمیان بھی اور مدارس مخالف  
کار ہیں ان کے مابین بھی۔۔۔ اس ”مدارس  
دیا جاسکتا ہے جس کی بدولت نہ صرف غلط  
کے نتیجہ میں مدارس کی وہ خدمات بھی اجاگر  
حقہ واقف نہیں ہیں۔

## کیسے کیسے لوگ!

صبح بنارس اور شام اودھ دونوں کے متعلق آپ نے سن رکھا ہوگا۔ اودھ میں موسم سرما کی آمد آمد اور اس موقع کی سردی (جسے گلابی سردی کہا جاتا ہے)، کچھ ایسی نرالی اور الیبلی ہے کہ کہنے والوں نے اسے شام اودھ کہا، تحیل کی پرواز سے کون کسے روک سکتا ہے اس لئے اپنے اپنے ذوق کے مطابق جو چاہے کسی تعبیر کو معنی پہنائے لیکن ہمارے نزدیک تو شام اودھ کی شان موسم کی خوشگوری ہی ہے۔

لیکن یہی سردی جب زور پکڑتی ہے اور شباب پر آتی ہے تو ستم ڈھاتی ہے اور ان دنوں کے روزناموں میں سردی سے ٹھٹھر کر مر جانے والوں کی خبریں ضرور شائع ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک سردرات کی بات ہے، کسی غم کھانے والے کے دل میں رات گئے خیال آیا کہ چلو لکھنؤ چارباغ اسٹیشن چلیں، کھانا ساتھ لے لیں اور جو بھوکا ملے اسے پیش کر دیں۔ کڑا کے کی سردی، لیکن موڈ بن گیا تھا اس لئے وہ صاحب چل پڑے، دیکھا کہ فٹ پاتھ پر کئی بے آسرا بے سہارا لوگ نیلے گگن تلے پڑے سو رہے ہیں لیکن ان میں چند ایک جاگ بھی رہے ہیں شاید ٹھنڈک نے انہیں سونے نہ دیا ہو، وہ جس قدر بھوکوں تک کھانے کے ساتھ پہنچ سکے، پہنچتے رہے۔

ان کا یہ خاموش لنگر جاری تھا کہ دیکھا کہ ایک گاڑی رکی۔ اس میں سے گرتا پاجامہ پہنے ایک شخص اترا، سردی کی وجہ سے چہرہ ڈھانکے ہوئے۔ پھر وہ شخص آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں ایک گٹھری تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر بے خبر گہری نیند سونے والوں کے قریب پہنچتا اور انہیں کمبل اڑھاتا جاتا، دیر تک اور دور تک جا کر وہ کمبل اڑھاتا رہا۔

رگاہوں میں اجالے بکھیر دے اور اس کے رگوں میں گم کر دے۔

ی ہیں اور فراز بھی۔ یہاں چھاؤں کے ساتھ کے ساتھ ناکامی بھی، فتح کے ساتھ شکست بھی میں بھی اس کے صاف اشارے موجود ہیں، احد کی پسپائی بھی، اسپین کا زوال بھی ہے اور کہانی بھی ہے اور ان کا حلقہ بگوش اسلام ہو

یا شکست کو کاما (Comma) قرار دے، نہ ہے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ کاما قرار دینے کا عملی نوز نام تمام ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ دنیا ولید جیسے جلیل القدر سپہ سالار کو میدان سے بلے کی فوج تعداد میں بہت بڑی تھی۔

پ قرار دینا قنوطیت پسندی ہے اور اسے کاما

می کوئل اسٹاپ سمجھ کر کاما قرار دے لے تو اس میاب ہے کہ اس نے پہلے مرحلے میں یاس ینا مردانگی بھی ہے اور عین دینداری بھی اس

مکفرون) یقیناً رب کی رحمت سے ناامید وہی (۸۷)



ب انہیں دیکھتے رہے اور پہچاننے کی کوشش  
 ماس ہوا کہ غریبوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے  
 لے آدمیوں کی بھیڑ سے تو انہیں واسطہ پڑتا  
 ایک ”انسان“ کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے  
 ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ لیکن ہمت نہ پڑی  
 وہ جا!

ن کی آنکھیں یہی منظر دیکھتی رہیں اب ان  
 کے پاس جا کھڑے ہوئے اور کبل اڑھانے  
 سے خود پر طاری کیفیت اور تاثر کا اظہار کر ہی

ننا چاہی، اس کا چہرہ سردی سے بچاؤ کے لئے  
 سب اس کے چہرہ سے کپڑا سر کا تو وہ صاحب  
 اس کی تصویر اکثر و بیشتر اخبارات کی زینت بنتی  
 تصویر شاید اس کی اصل تصویر نہیں، بلکہ اصل  
 رزاتر پردیش جناب عثمان عارف کا چہرہ تھا!  
 عارف ایک خانقاہی خاندان کے چشم و چراغ  
 کا خون دوڑ رہا تھا جن کی فطرت میں خدمت  
 دینے والا دے، لیکن اس طرح سے دے کہ  
 ایسی سخاوت ایک ایسا عثمان ہی کر سکتا ہے جو  
 نیت کی کچھ لذت یا اہل معرفت کی صحبت بھی

س گاہ کے ایک ذمہ دار کے متعلق ان کے ایک

ملازم نے بتایا کہ ایک مرتبہ موصوف نے علی الصبح مجھے بلایا، سخت سردی پڑ رہی تھی کہا کہ کیا تم  
 میری مدد کرو گے؟ ملازم نے کہا حکم فرمائیں تو کہا کہ یہ چند گرتے ہیں (اور سب کے سب  
 گرتے نئے تھے) انہیں پل کے کنارے سوئے ہوئے لوگوں کے سر ہانے رکھتے ہوئے  
 چلے جاؤ۔ اور دیکھو انہیں جگانا نہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ بلایا اور کہا کہ اپنے ادارہ میں جہاں جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا  
 جاتا ہے وہاں چلے جاؤ، ردی چننے کے لئے آنے والوں کے وقت سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ  
 اور یہ پیکٹس (Packets) وہاں پھینک آؤ۔ کیا تھا ان پیکٹس میں؟ پوسٹ کارڈ، لفافے،  
 ٹکٹ..... شاید ان کی نیت یہ ہو کہ ردی چننے والوں کے ہاتھ کبھی کوئی نئی اور غیر استعمال  
 شدہ چیز بھی لگے اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دے!!

غریبوں کا غم کھانے اور ان کی مدد کرنے کے لئے بہانہ ڈھونڈنے والے یہ لوگ  
 اب وہاں پہنچ گئے جہاں رحمت حق مغفرت اور نوازشوں کے لئے بہانے تلاش کرتی ہے۔  
 اللہ ان سب کو غریق رحمت کرے۔

قصور اسی کا تھا Accident کے اس منظر کو دیکھنے والے یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہی کوئی سلامت بچا ہو، لیکن الحمد للہ مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی، میرے مالک نے مجھے بچا لیا تھا۔ پولیس نے مجھ سے کہا کہ آپ جیب والے سے ہر جانہ وصول کر سکتے ہیں، میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں اس نے کہا کہ تلاش معاش میں آیا ہوں اور حج کے ایام میں اس طرح کچھ آمدنی پیدا کر لیتا ہوں، میں نے پولیس سے کہا کہ میں انہیں معاف کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں کرین آئی جو میری گاڑی کو ٹھکانے لگانے کے لئے لے کر چلی گئی، میری آنکھیں وہاں ایسی جگہ تلاش کرنے لگیں کہ جہاں میں موت کے منہ سے صحیح سالم نکل آنے پر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوسکوں....“

پریم آنکھوں سے میں نے اس خط کو پڑھا، آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، یہ اپنے رب کے حضور عجز و نیاز اور تشکر و امتنان کے آنسو تھے، میں اپنے بھائی کی ایک ایسی تحریر پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا جس سے آنکھیں چھلک پڑیں۔ خدا کا انکار کرنے والا بھی موت کا انکار نہیں کر سکتا لیکن موت کے منہ سے صحیح سالم نکل آنے والے واقعات پر غور کریں تو ان کا دل بھی گواہی دے گا کہ اللہ کی قادر مطلق ذات نے ہر نفس کے موت کا وقت معین کر رکھا ہے، اگر اس کا وقت آگیا تو سارے وسائل اور کوششوں کے باوجود بھی جان بچائی نہیں جاسکتی اور اگر وقت نہیں آیا ہے تو بڑے بڑے حادثے سروں سے گزر جاتے ہیں لیکن بال بیکا نہیں ہوتا، سبحان تیری قدرت!

## قدرت!

اپنے بھائی ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین کا مکی میں واقع عیادۃ الحرم میں ایک ڈاکٹر کی ہر میرے بھائی ہیں اور چھوٹے بھائی ہیں اس ط میں یوں بھی نگاہ شوق سے پڑھتا ہوں اور ہے، تب سے تو ان کے خطوط حرم شریف کی لکھ دیتے ہیں، خصوصاً حرمین شریفین کے اس والدہ مرحومہ کے ساتھ نصیب ہوئی تھی۔ اسی اشتیاق سے چاک کیا لیکن اس میں لکھا ہے، پر اپنی گاڑی سے سفر کر رہا تھا کہ پشت سے سے ٹکرائی کہ ایک زوردار دھماکہ کے ساتھ سے آگ، گاڑی لٹو کی طرح گھومنے لگی جبکہ ہائی ٹاری سے گاڑیاں گزر رہی تھیں، مجھے موت کے لئے آنکھیں بند کر لیں تاکہ باسانی اسے گاڑی Tracks کے کنارے آکر ٹھہر گئی، میں اپنی گاڑی کے دروازے سے باہر نکل آیا، اتنی نپٹا کا نپٹا کھڑا تھا، ٹریفک اصولوں کے مطابق

آج دنیا میں ظلم کا دور دورہ ہے جو عالم انسانیت کے لئے یقیناً تشویشناک ہے لیکن ایک بات اس سلسلہ میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ظلم کے فروغ پانے اور پھیلنے، پھولنے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ بُرائی کو بُرائی کہنے میں ہم دُہرے معیار کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ اپنوں کے لئے ایک پیمانہ ہے اور دوسروں کے معاملہ میں دوسرا پیمانہ۔ جبکہ بُرائی کو بُرائی قرار دینے کی کسوٹی ایک ہونی چاہئے۔ اپنوں اور غیروں کے قصور کے معاملہ میں الگ الگ پیمانے اختیار کرنا نہ صرف ظلم ہے بلکہ ظلم کا بیج بونا ہے۔

دوہرے معیار (DOUBLE STANDARD) کو اختیار کرنا ظلم کو فروغ دینا

ہے جبکہ اس سے باز رہنا ظلم پر پہرے بٹھانا!

### ☆ ایک کشتی ایک ملاح

ایک نو مسلم خاتون نے تلاش حق کی اپنی روداد (MY JOURNEY FROM

WESTERN ATHIESM TO ISLAM) میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ MESS میں کھانا کھا رہی تھی۔ اس کے پہلو میں کھانا کھا رہی ایک دوسری خاتون نے اسے اپنے کھانے میں سے کچھ پیش کرنا چاہا جس سے اول الذکر خاتون کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ ایک مسلمان خاتون ہے اور جو چیزیں یہ مجھے پیش کر رہی ہے، یہ کھانا اس کے مذہب کے مطابق جائز نہیں لہذا اس کو ہماری طرف بڑھا رہی ہے۔

حق کی جستجو میں وہ سرگرداں تھی ہی، چنانچہ ایک مسلمان خاتون کو دیکھ کر اس نے چاہا کہ اس سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھا جائے۔ اس نے کہا کہ یہ بتائیے کہ اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے۔

مخاطب خاتون نے جواب میں بتایا کہ دنیا کے اس کارخانہ کا نظام بحسن و خوبی چلانے کے لئے اسلام نے عورت اور مرد کے لئے علیحدہ علیحدہ رول (Role) رکھے ہیں مثلاً روزگار کی فراہمی اور خاندان کی نگہبانی مرد کے ذمہ ہے جبکہ بچوں کی تربیت و نگہداشت

## وہی تنکے لئے

لے جرم میں پکڑی گئی، وہ ایک امیر گھرانے کی ٹو بارگاہ رسالت میں سفارش کے لئے بھیجا، رکھتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ حضور قبیلہ کی کر دیں گے۔ اس کے برعکس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا، آپ صلی اللہ سے پہلی قومیں اسی لئے ہلاک ہو گئیں کہ جب سے چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن جب کوئی عام آدمی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ بھی چوری (بخاری و مسلم)

اسلام بُرائی کو بُرائی قرار دینے میں اپنوں اور نہنے میں نہ قرابت داری مانع بنتی ہے اور نہ عقیدہ تائیدوں میں ایک اور واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک ایک یہودی کے درمیان کوئی تنازعہ تھا۔ دونوں یہود کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے جس فیصلہ دیا۔

رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ صرف ان کی اپنی ایمانداری کافی نہیں بلکہ ان کے قریبی لوگوں اور معاونین و مصاحبین کا بھی ایماندار ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ایک اہم منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے میری ذمہ داری بھی اہم ہے، مجھے ہر وقت نگاہ رکھنی ہوگی کہ قربت کے نتیجہ میں میرے منصب کا غلط استعمال میرا سکرپٹری نہ کرنے پائے یا میری شریک حیات یا میرا بیٹا اس منصب سے غلط فائدہ نہ اٹھائے وغیرہ۔

اجتماعی کاموں سے وابستہ شخصیتوں کے لئے واقعتاً بڑی نزاکتیں ہیں ان کے حصہ میں آنے والی عقیدت و محبت ایک ایسا آئینہ ہے جس کو ٹھیس پہنچانے کا سبب وہ افراد بنتے ہیں جن کو قد آور شخصیتوں کا اعتبار و اعتماد حاصل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کی عظیم المرتبت شخصیتوں نے انتظام و انصرام میں کل پرزوں کے موزوں ہونے پر بڑی توجہ دی خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اس کی درخشاں مثالیں موجود ہیں کہ کس طرح امیر المومنینؓ نے جزئیات پر نگاہ رکھی اور بیدار مغزی سے حسن سیاست و حسن انتظام کی مثالیں قائم کیں۔

☆ ایک خدا لگی بات :

ایک معاصر رسالہ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام محدث جلیل مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمیؒ کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں علامہ کی سیادت میں اور مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینیؒ کی صدارت میں علماء اسلام کا ایک بہت بڑا اور تاریخی جلسہ پہلی بار بین الاقوامی سطح پر ہو رہا تھا۔ اس کا دعوت نامہ علامہ نے محدث جلیل کے نام بھیجا، جواب میں مولانا اعظمیؒ نے علماء کے لئے عربی زبان میں ایک پیغام ارسال کیا جو طبقہ علماء اور خصوصاً حلقہ طلباء (جو کل کے علماء ہیں) کے یاد رکھنے کا ہے، محدث جلیل نے تحریر فرمایا تھا:

”بخدا آپ حضرات عالم اسلامی کے جسم میں ایک ٹکڑا (دل) ہیں کہ جب وہ

نے عام فہم مثال دی کہ گھر کا نظام چلانا کشتی نے اور اسے سلامتی کے ساتھ کنارے تک ہے۔ اور اس کی پتوار دو ملاحوں کے ہاتھوں نام کی باگ ڈور بھی صرف مرد کے ہاتھ میں والفت اور احترام و تعاون کا بھی لحاظ رکھا کر کا نظام خوش اسلوبی سے چل سکے۔ الرجال قدر سادہ و آسان اور عام فہم انداز میں اس

"AS NO BOAT CAN SAIL WITH

IS GIVEN THE POSITION OF

اصول ہے جس کی حقیقت و صداقت اور جس تاریخ ہوتا ہے گھر ہو یا ادارہ، کارخانہ ہو یا تنظیم، رت اور مرحلہ میں ایک آخری اور قطعی فیصلہ کی وقائم رکھتی ہے اور اسے متوازن بنائے رکھتی آنکھوں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ البتہ کھلے دل ہے۔

پر بھی نظر!

پنی پریس کلب میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا اس س لئے بھی کہ وہ خود منصف کے عہدہ پر فائز سستہ افراد کو ہمہ وقت چوکنا رہنا اور اس کا خیال

## جستہ جستہ

جب ”کاروانِ زندگی“ کے مصنف نے اپنا مقصدِ حیات تحریر فرمایا:

ایک مرتبہ نائرمیڈیکل کالج ممبئی کے سالانہ میگزین TONAMEC کے لئے اُس سال کے طالب علم ایڈیٹر ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین نے مشاہیر ملک و قوم کے نام ایک سوال لکھ بھیجا کہ ازراہِ کرم آپ تحریر فرمائیں کہ آپ کا مقصدِ حیات کیا ہے۔ اس سوال کا جواب لکھ بھیجنے والوں میں دنیا کے مشاہیر شامل تھے جن میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندویؒ کا بھی تھا۔

اصل جواب انگریزی میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے: ”میری زندگی کا مقصد اور نصب العین بلکہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین، کائنات کے خالق و مالک کے حضور مکمل خود سپردگی اور تسلیم و نیاز کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے! میں زندگی کو ایک امانت سمجھتا ہوں جس کا ہر لمحہ بیش قیمت ہے، دنیا میرے لئے امتحان گاہ ہے اور یہ زندگی کی ایک آزمائش! میں اپنے ہر قول و فعل کے لئے خود کو اللہ کے حضور جواب دہ سمجھتا ہوں جس کے سلسلہ میں آخرت میں مجھ سے سوال کیا جائے گا۔

اس لئے میری زندگی کا بنیادی مقصد اپنے رب کی رضا و خوشنودی کا حصول ہے، اس کی اطاعت و بندگی کے ذریعہ بھی اور حقوق العباد کی ادائیگی کی راہ سے بھی۔ سب کے ساتھ منصفانہ و ہمدردانہ رویہ اور تعاون و خیر خواہی کا جذبہ اپنا کر۔ اور اپنی مقدر و بھر صلاحیت کے مطابق نسل انسانی کی وحدت و مساوات اور اس کی عظمت و حرمت کے لئے جدوجہد

خراب ہوگا تو پورا جسم خراب ہو جائے گا۔“  
دیا لیکن اس کے ساتھ اپنے دل کی ایک بات  
مرد و تحریر میں یہ بھی کہہ ہی دی کہ ”میرا روئے  
س کو دیکھ کر عوام کے قلوب سے دین کی عظمت

کا شکر ہے کہ معاشرہ ربانی اور خدا ترس علماء  
میں عبادہ العلماء کی عملی تصویر پیش کرنے لگے  
معاشرہ پر وہ خوشگور و مثبت اثرات مرتب ہوئے  
ور آج اخلاقی زوال کا یہ دور تو اس کا ضرورت  
! کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟۔

## حضرت ناظم ندوۃ العلماء کا ایک نٹرویو

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ، ناظم ندوۃ العلماء سے ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء کو روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی کے نمائندہ نے ایک انٹرویو لیا، اپنے اس انٹرویو میں مولانا نے محترم نے مسلمانوں کو درپیش صورت حال کے اسباب گنائے، اسباب ظاہری کے ساتھ اسباب باطنی کی طرف بھی مسلمانوں کو متوجہ فرمایا۔ اس حقیقت پسندانہ اور چشم کٹھا انٹرویو کا جس کی حیثیت متن ہے وہ اس لائق ہے کہ اُسے نہ صرف مکمل پڑھا جائے بلکہ بار بار پڑھا جائے۔ سر دست اس کے مندرجات میں سے دو باتوں کا تذکرہ مقصود ہے۔ مولانا نے کہا کہ:

(۱) ”مسلمانوں کی غلطی، سستی اور فرائض منصبی سے مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ہی آج مسلمان مشکلات سے دوچار ہو رہا ہے۔“ نیز یہ کہ

(۲) ”آج اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے گمراہ کن پروپگنڈہ برادران وطن کے ذہن میں یقین کی صورت اختیار کر گیا ہے۔“

(۱۳ مئی ۲۰۰۲ء)

بظاہر یہ دو باتیں ہیں لیکن سچ پوچھئے تو ایک ہی سلسلہ کے دو رخ ہیں۔ پہلی بات کو اگر ”عمل“ قرار دیا جائے تو دوسری بات اس کا نتیجہ اور انجام قرار پائے گی۔ یا یوں کہئے کہ اگر پہلی بات مصرعہ اولیٰ ہے تو دوسری بات مصرعہ ثانیہ..... یہ امت، امت دعوت ہے اور روئے زمین پر اگر اس کے وجود کے باقی رہنے کا کوئی جواز اور اس کی کوئی مضبوط بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ امت، امت دعوت کی حیثیت سے اپنا فریضہ نبھائے اور اگر خدا نخواستہ وہ اپنے فرض منصبی ہی کو بھول بیٹھی ہے تو اس کو وجود کے باقی اور سلامت رہنے کا جواز بھی ختم ہو جاتا ہے..... اس امت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ انسانوں کو جہنم کی آگ سے ڈرائے اور اس سے خوف دلائے اور اسی درد مندی و دل سوزی اور کرب و بے چینی کے ساتھ وہ اپنا یہ فریضہ انجام دے جیسا کہ اس کام کا حق ہے اور ماضی میں داعیان حق نے جس کی روشن

سے اردو میں بھی یہ تحریر سامنے آ پاتی تو ایک ”حسنی“ جاتا! بہر حال اس عاجز و درماندہ کے ترجمہ کے بہر سے مطلب دوسرے کاربنا چاہئے۔

ح” ہر لمحہ اللہ کے حضور جواب دہی کا احساس۔ یہی وجہ تھی کہ کیا اپنے اور کیا پرانے، حضرت سے قریب رہنے والے قریب تر ہوتے چلے مق کے درجہ کو پہنچتی چلی گئی۔ ان کے ایک نیاز بی حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندویؒ رت مولانا کے جذبہ احسان مندی کا یہ عالم تھا پیش کیا تو انہوں نے اس کو بھی یاد رکھا اور اس سلسلہ میں جو شخصیت اس قدر حساس رہی ہو، وہ ہوگی، اس کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں! رشک رہی اور اللہ نے انہیں موت بھی قابل ما عبداللہ عباس ندویؒ نے ان کی وفات پر لکھا عنوان بھی خوب منتخب کیا:

”رگ“ جیسی کتابوں کے مصنف اور ”تحریک س لائق ہے کہ وہ ہمہ وقت ہمارے پیش نظر فنا کے حصول کے راستہ کی نشاندہی بھی کر دی کا حوصلہ دکھائے! بقول شاعر

کھیل نہیں ہے  
شیشہ و آہن

اندر کے سماں کی منظر کشی جن لفظوں میں کی ہے اسے پڑھئے اور نہ صرف سردھنئے بلکہ اللہ کے حضور با چشمِ نم دعا و آرزو بھی کیجئے کہ اللہ اس عبارت کے پڑھنے والوں کو بھی اس سعادت سے مشرف فرمائے..... اس کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں۔

مولانا رقم طراز ہیں:..... ”اس کعبہ کمرہ کے وسط میں تین ستون ہیں جن کے درمیان بالائی سطح پر ایک تار ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تنا ہوا ہے۔ اس تار میں کثیر تعداد میں ظروف لٹکے ہوئے نظر آئے، تانبے، پیتل اور نکل کے یہ ظروف قدیل ہیں یا قدیل نما۔ کسی زمانہ میں مستعمل رہے ہوں گے یا بطور ہدیہ نذر کئے گئے ہوں گے، تار کے عین نیچے فرش پر چند چوبی صندوق نظر آئے جو ان عطریات سے مالا مال ہیں جو کعبہ کی اندرونی فضا کو معطر کئے رہتے ہیں، دیواروں کی اندرونی فضا کو معطر کئے رہتے ہیں، دیواروں کی اندرونی بالائی سطح سبز رنگ کے منقش غلاف سے ڈھکی ہوئی ہے یا یوں کہئے کہ غلاف دیوار پر پیوست ہے۔ خطیم کی جانب کا دایاں کونہ دو دیواروں سے فرش تا چھت بند دکھائی دیا جس کے ایک طرف سونے کے دروازے کی موجودگی کعبہ کے اندر ایک اور بند حجرہ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ دروازہ کے ساتھ بائیں جانب کتبہ کی موجودگی نے اس عقدے کو حل کیا یہ کتبہ بتا رہا تھا کہ شاہ خالد بن عبدالعزیز کے عہد میں سال ۳۹۷ھ میں کعبہ کی سیڑھی کی تجدید کی گئی۔ اس سے مراد وہ گول آہنی سیڑھی ہے جو صفائی کرنے والوں کو کعبہ کی چھت تک لے جاتی ہے اور جس سے یہ حجرہ زائرین کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔“

### لداخی زبان میں ترجمہ قرآن

میرے رفیق و ہمدم دیرینہ مولانا محمد عمر لداخی ندوی کا چند دنوں قبل ایک خط لیہہ لداخ سے موصول ہوا۔ وہ جامع مسجد لیہہ کے امام ہیں، اللہ نے ان میں بہت سی خوبیاں رکھی ہیں جن میں راقم کے نزدیک ان کی بنیادی خوبی ”بے قراری“ ہے، اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ دین حنیف کی اشاعت و سر بلندی کے لئے!! ع

لیکن اس موقع پر یہ بات بھی خوب سمجھ لینے کی توجہ اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ ہم ”دعوت“ کے گئے۔۔۔۔۔ مقدرات کو کون ٹال سکتا ہے لیکن کاسلسلہ اخلاص و دردمندی اور بے قراری سے مسلمانوں پر آفتیں اور بلائیں ٹل جاتیں۔

یہ سماں!

میں ہی کیسی لذت و حلاوت اور کتنی کشش میں ان کا تصور و خیال ہی آجائے تو ایک مسلمان تہی، دل باغ باغ ہو جاتا اور آنکھیں نم ہو جاتی ملے گا جس کے سینہ میں کعبہ اللہ اور روضہ اطہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کی اللہ کا وہ طواف، حجر اسود کو وہ بوسہ دیتے لوگ، بھلتے لوگ..... اللہ! اللہ! کیا سماں ہوتا ہے! یہ تو بتاتا ہے کہ کعبہ اللہ کی عمارت کے اندر کا عالم کیا ہے خوش نصیبوں ہی کو نصیب ہوتا ہے.....

عالم اسلامی کی چوتھی عالمی اسلامی کانفرنس مکہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے کے قریب علماء و قائدین نے اس میں شرکت (گلوبلائزیشن) چنا گیا تھا، اس مبارک موقع کے اندر جانے کا پروانہ بھی دیا گیا ان خوش نصیب بھی تھے، موصوف نے کعبہ کی عمارت کے

کو نصیب ہو جائے

سناٹی ہے، لداخی زبان میں قرآن پاک کے نام کے ساتھ وہ اپنے ایک لداخی یات قرآنی کا ترجمہ شروع کر چکے ہیں۔ توقع جلد مکمل ہو جائے گی، لداخی زبان کے سلسلہ میں لکھی ہیں مثلاً یہ کہ لداخی زبان بلتی (Balti) تان کے شمالی حصہ بلتستان (Baltistan) میں (Script) تبتی (Tibetan) زبان جیسا ہے کئی حصوں میں رائج ہے اس لئے خود لداخی اسپیتی (Spiti) کے پدر (Padar) اور نیپال اور بھی جاتی ہے۔

ام ایک ایک گھر اور ہر ایک در تک انشاء اللہ پہنچ رہے کہ ترجمہ قرآن کا یہ قرعہ فال ان کے نام کھل کے حصہ میں آ رہا ہے۔ خدا انہیں ہمت و حوصلہ میں ان کا حامی و ناصر ہو۔ ان سے قبل حاجی ہلے پارہ کا ترجمہ کیا تھا مگر وہ مکمل نہ ہو سکا تھا، خدا یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچے بلکہ وہ لداخی زبان میں مائیں، دیا کو پار لگانے والا تو اللہ ہی ہے!!

## طلباء کے لئے

کامیاب زندگی کے گر

اور عام قارئین کے لئے

خود کو میسر و ممتاز بنانے کا احساس جگانے والی کتاب

معروف صحافی اور صاحب طرز ادیب جناب امین الدین شجاع الدین صاحب کے قلم سے

وفیات پر مشتمل مضامین کا اہم مجموعہ

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

جلد ہی منظر عام پر آ رہا ہے

جس میں

مشاہیر ملک و ملت کے علاوہ ندوہ کے اساتذہ کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے

ان مضامین میں

ان کی حیات و خدمات کا ایک اجمالی خاکہ آ گیا ہے

جس میں مختلف گوشہ ہائے حیات کا احاطہ ہوتا ہے

جو وفیات بھی ہے اور مختلف میدانوں میں کامیابی کا اشاریہ بھی